نومبر 2016
صفحہ نمبر 5

تعلیم و تربیت

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک شخص اس قدر مفلس اور نادار تھا کہ تن ڈھانکنے کے لیے اس کے پاس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ وہ اپنا جسم ریت میں چھپائے رکھتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے تو اس شخص نے درخواست کی کہ یا حضرت! میرے لیے اللہ پاک سے دعا فرمایئے کہ وہ میری غربت دُور فرما دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر رحم آ گیا۔ آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی اور اللہ رب العزت نے چند دنوں ہی میں اس کی غربت کو خوش حالی میں بدل دیا۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے تو آپ نے دیکھا کہ اس شخص کو لوگوں نے پکڑ رکھا ہے اور اسے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ حضرت فوراً وہاں پہنچے اور لوگوں سے پوچھا کہ تم اسے کیوں ستا رہے ہو، کیا اس نے کوئی خطا کی ہے؟

لوگوں نے جواب دیا۔ "یہ بہت خراب اور آوارہ آدمی ہے۔ پہلے تو شراب پی کر غل غپاڑہ ہی کرتا تھا۔ آج اس نے ایک بے گناہ عورت کو قتل کر دیا۔ اب اسے قاضی کے پاس لے جائیں گے اور وہ اس کے سنگین جرم کی سزا دے گا۔"

لوگوں نے بتایا کہ جب سے یہ خوش حال ہوا، لوگوں کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ اس کی خوش حالی اس کے لیے عذاب ثابت ہوئی۔

پیارے بچو! یہ ناقابل تردید سچائی ہے کہ اگر بدفطرت انسان کسی طرح طاقت حاصل کر لیتا ہے تو وہ دُنیا کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ کسی کے شریف اور غیر شریف بن جانے کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فرق موجود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے کہ اللہ پاک نے جبر سے کسی کو شریف اور کسی کو کمین نہیں بنایا بلکہ یہ دونوں حالتیں انسانوں کے اپنے اعمال و خیالات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور یہ بات بالکل ممکن ہے کہ بُری عادات کو ترک کر کے ایک بدفطرت شخص شریف اور بُری عادات میں پھنس کر ایک شریف آدمی رذیل بن جاتا ہے۔ اگرچہ دُنیا کا نظام چلانے کے لیے انسانوں کا مختلف حیثیتوں میں ہونا فطرت کا تقاضا تو ضرور ہے لیکن یہ بات انسانوں کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ زندگی کے سٹیج پر اپنے لیے کون سا کردار پسند کرتے ہیں اور ان کا یہی اختیار انہیں نباتات، جمادات اور حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے بہت بڑے مسلمان رہنما تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئے اسلامی ملک کے قائم ہونے کی خوش خبری سنائی۔ اس خوش خبری نے بعد میں حقیقت کا رنگ اختیار کیا اور ہمارا عزیز وطن پاکستان دُنیا کے جغرافیے پر ایک نئی شان سے اُبھرا۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی بھولی بسری کہانیوں کو ازسرِنو زندہ کرنے کے لیے شاعری کو اپنے مقصد کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ علامہ اقبالؒ نے جہاں بڑی عمر کے لوگوں کو اپنے اندر خودداری اور بلند ارادے رکھنے اور ان پر عمل کرنے کا مشورہ دیا، وہاں اپنی قوم کے بچوں کو بھی نہیں بھولے۔ آپ نے مسلمان بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی بڑی خواہش رہی کہ مسلمان بچے قوم کے شاہین بنیں۔

اگر آج سے سب بچے پکا عہد کر لیں کہ ہم اپنے قومی شاعر علامہ اقبالؒ کی تعلیمات اور فکر پر عمل کر کے اچھے انسان بنیں گے تو یقین جانیے آپ کی تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی اور آپ اپنی دُنیا کو جنت میں بدل دیں گے۔ کیا آپ سب اس کے لیے تیار ہیں......؟

لیجیے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: چچا چھکو شادی میں گئے

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر:

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپرس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہِ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپرس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

حمد باری تعالیٰ

تیری آس پہ شاہ و فقیر
تجھ کو یکساں غریب و امیر
کھلیں گے غنچے تیرے ذکر سے
ہم کو جلا ہو تیری فکر سے
بدل گئے ہیں گرچہ حالات
مگر ہے اونچی تیری ذات
سچائی پہ مٹنے کو ہو جو تیار
نہیں ہوتا وہ کبھی دنیا میں خوار
تیری ہی یاد سے جو بس جائے من
جو اجڑے ہیں وہ بنتے ہیں چمن
مانگیں خدا سے یہ ہر دم
ہوں نہ راہ سے دور قدم
رکھیں ہر دم رب کی آس
بھائے نہ غیر کی بوباس
خدایا بچا لے غیر کے خیال سے
ہے واقف صرف تو میرے حال سے

نعت رسول مقبول ﷺ

وہ آئے تو دنیا میں آئی بہار
ملا گلشنِ زندگی کو نکھار
زمانے میں ہر سو جہالت تھی عام
ہزاروں بتوں کی تھی ہستی غلام
نہ مظلوم و بے بس کی تھی کوئی راہ
کوئی بھی کسی کا نہ تھا خیر خواہ
چنی تھی جو حق نے جبینِ بشر
جھکی تھی معبودانِ باطل کے در
مگر اس کی رحمت ہوئی جوش میں
محمد کی صورت میں لے لی خبر
چراغ ہدایت نے پایا ظہور
مکمل میسر ہوا جگ کو نور
اسی کی چمک سے یہ تابانیاں
مرے رب کی ہیں یہ مہربانیاں
الٰہی غلامی محمد کی دے
نسیم تیری بندی کی تو ہی سنے

نسیم اختر نسیم

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ کا ہم پر کس قدر فضل و احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی اُمت میں پیدا فرمایا ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپؐ کی اُمت، آخری اُمت ہے۔ اس اُمت کو "اُمتِ محمدیہ" کہا جاتا ہے۔ اُمتِ محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے پہلی اُمتوں پر فضیلت بخشی ہے اور بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے جن کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ ان میں سے صرف چار فضیلتوں اور خصوصیات کو ذکر کیا جاتا ہے:

پہلی خصوصیت...... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "(مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران:110)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو "بہترین اُمت" کا لقب دیا ہے اور بہترین اُمت ہونے کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ تم بھلائیوں کی راہ دکھاتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو۔

حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ نبی پاکؐ نے مذکورہ آیت کی تشریح میں فرمایا کہ "تم سے پہلے اُنہتر اُمتیں گزر چکی ہیں، تم سترویں اُمت ہو۔ تم اللہ کے نزدیک سب اُمتوں میں سے بہتر اور باعزت ہو۔" (ترمذی، ابواب تفسیر القرآن:3001)

دوسری خصوصیت...... اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو بے حد شفیق نبی عطا فرمائے ہیں۔ چناں چہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ "(لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے، جس کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمہاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے، جو مومنوں کے لیے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہیں۔" (التوبۃ:128) اُمت کے افراد کے ساتھ آپؐ کی رحمت و شفقت بے پناہ تھی جس کے بے شمار واقعات ہیں۔

تیسری خصوصیت...... حضرت ابراہیمؑ جن کو ابو الانبیاء (نبیوں کا باپ) اور خلیل اللہ (اللہ کا دوست) کہا جاتا ہے، انہوں نے اس اُمت کو سلام بھیجا ہے اور آپؐ کے واسطے اس اُمت کو نصیحت فرمائی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ جنت کی نعمتیں کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس رات مجھے معراج کی سیر کرائی گئی، میں ابراہیمؑ سے ملا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اے محمد ﷺ! اپنی اُمت کو میری طرف سے سلام کہہ دینا اور انہیں آگاہ کر دینا کہ جنت کی مٹی عمدہ ہے اور پانی میٹھا ہے اور بلاشبہ وہ چٹیل میدان ہے اور اس کے پودے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ہیں۔ (ترمذی، ابواب الدعوات 3462)

اگرچہ جنت میں بے مثل نعمتیں ہیں لیکن جو نیک عمل سے خالی ہے، اس کے لیے یہ جنت چٹیل میدان ہی کی طرح ہے۔ اس کی نعمتوں سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جو اچھے اعمال کر کے آخرت میں پہنچے گا۔

چوتھی خصوصیت...... بخاری و مسلم کی روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب نبی پاکؐ معراج شریف کے لیے آسمانوں پر تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ کو نماز کا تحفہ ملا، ایک دن میں پچاس نمازیں۔ جب آپؐ کا واپسی پہ حضرت موسیٰؑ پر گزر ہوا، تو انہوں نے آپؐ سے فرمایا کہ آپؐ کی اُمت روزانہ پچاس نمازیں نہ پڑھ سکے گی، اس لیے آپؐ اپنے رب کے پاس واپس جایئے اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف کا سوال کیجئے۔ چناں چہ آپؐ واپس تشریف لے گئے اور رب تعالیٰ کے حضور اپنی اُمت کے لیے اس حکم میں تخفیف کا سوال کیا۔ لہٰذا نمازیں کم کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ یوں حضرت موسیٰؑ نے اس اُمت کے ساتھ خیرخواہی فرمائی۔

پیارے بچو! جب ہم اس پیاری اُمت میں سے ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ اور اپنے پیارے نبیؐ کے حکموں پر دل و جان سے عمل کرنا چاہیے۔

☆☆☆

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر

علی اکمل تصور

صبح منہ اندھیرے کرم علی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے کوئی بہت جلدی میں ہو۔

''آ گئی مصیبت......'' کرم علی نیند میں ڈوبی آواز میں بولا۔ پھر وہ کراہتے ہوئے اُٹھا۔ اتنے میں پھر سے دستک ہوئی۔ اس بار انداز پہلے سے زیادہ زور دار تھا۔

''صبر کر گلابے ...... دروازہ کمزور ہے...... اندر کی طرف آ گرے گا۔ کھولتا ہوں......'' کرم علی سمجھ چکا تھا کہ باہر کون ہے۔ اس نے کنڈی گرائی تو باہر موجود گلابا قدرے تیز لہجے میں بولا۔

''چاچا...... روزانہ مجھے تیری وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔''

''بوڑھا ہو گیا ہوں بیٹا...... رات کے پہلے پہر نیند نہیں آتی اور جب رات کے پچھلے پہر آنکھ لگتی ہے تو تم آ جاتے ہو۔''

''تو پھر نہیں آتا میں...... کوئی اور دودھ والا رکھ لو۔'' گلابا ناراض ہو گیا۔

''اے گلابے...... تو میرے بیٹے جیسا ہے...... کیسی بیگانوں والی بات کر ڈالی۔''

''اچھا تو پھر اپنوں والی بات کرتا ہوں۔ میں اگلے گھر جا رہا ہوں، دودھ لینے...... میری واپسی تک بھینس کو چارہ ڈال دو۔ پانی پلا دو۔ پھر مجھے شہر دودھ لے کر جانا ہے...... دیر ہو رہی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم...... شہر میں نوکری کرنے والوں کو وقت پر ناشتے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو وقت پر اسکول جانا ہوتا ہے۔''

''چھوڑ گلابے...... مجھے سب معلوم ہے مگر تو شاید بھول رہا ہے کہ ہم گاؤں والے شہر والوں سے زیادہ وقت کے پابند ہیں۔''

کرم علی کی بات سن کر گلابا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ بولا۔

''کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہیں...... چلیں جلدی کریں۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔'' اتنا کہہ کر گلابا اپنی سائیکل پر سوار ہوا۔ سائیکل کیا تھی۔ سائیکل کا ڈھانچہ تھا۔ پیچھے کیریئر کے ساتھ لگی ہکوں میں دودھ والے برتن لٹک رہے تھے۔ پھر وہ تیزی سے اگلے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور کرم علی اپنی بھینس کی خاطرداری میں مصروف ہو گیا۔ ابھی واپس آ کر گلابے نے بھینس کا دودھ دھونا تھا۔

اب گلابا نظام کے گھر پہنچا۔ نظام کی دو بھینسیں تھیں۔ نظام بے تابی سے گلابے کا منتظر تھا۔ اس کی بھینسیں کھرلی میں موجود چارے پر منہ چلا رہی تھیں۔

''دیر کر دی گلابے......'' نظام بولا۔

''نہیں وقت پر آیا ہوں۔'' ان دونوں نے کھلے منہ والے سلور کے برتن پکڑ لیے۔ ان برتنوں میں پانی موجود تھا۔ اس پانی کی مدد سے انہوں نے بھینسوں کے تھن دھونے تھے اور انہیں دودھ دینے پر آمادہ کرنا تھا۔ اس عمل میں انہیں دو منٹ لگے۔ اب نظام نے پہلی دھار نکالی۔ جیسے ہی یہ دھار برتن کی اندرونی دیواروں سے ٹکرائی۔ گلابا چونک پڑا۔ وہ اُٹھا اور نظام کی طرف لپکا۔

''چچا...... یہ کیا کر رہے ہو...... برتن میں موجود پانی تو گرا دو۔''

''او بیٹا...... خیال نہیں رہا۔'' نظام شرمندہ ہو گیا۔

''یہ خیال تمہیں اکثر نہیں رہتا...... کتنی بار کہا ہے کہ جب میں

تمہیں دودھ کی پوری قیمت دیتا ہوں تو پھر بے ایمانی کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہو...... چلو پیچھے ہٹو...... میں خود ہی نکال لوں گا۔'' اب نظام کو بھینس کے نیچے سے اُٹھنا ہی پڑا۔ گلابے نے آناً فاناً دونوں بھینسوں کا دودھ نکالا۔ گڑوی کی مدد سے پیمائش کی اور یہ جا، وہ جا۔

''بہت سمجھ دار ہو گیا ہے۔'' اس کے جانے کے بعد نظام نے جیسے خود سے کہا۔

گلابے کا باپ بھی گوالا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد گلابے کو یہ کام وراثت میں ملا۔ پہلے وہ کسی فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا، پھر اس نے اپنا وراثتی کام سنبھال لیا۔ اس کام کا سلیقہ پانے میں اسے ایک ماہ لگا تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ہر کام آسان ہوتا چلا گیا۔ یہ کام اس لحاظ سے بہت سخت تھا کہ سردی ہو، گرمی ہو، آندھی ہو، طوفان ہو، خوشی ہو، غم ہو، اس کام میں چھٹی نہیں ہے۔ ہر حال میں یہ کام نبھانا ہی پڑتا ہے۔ اس کام میں گلابے کا بس ایک ہی اصول تھا۔ وہ خود بے ایمانی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی کو کرنے دیتا تھا۔

دوسرے گوالے بیس کلو خالص دودھ سے چالیس کلو ملاوٹ والا دودھ تیار کرنے کا فن جانتے تھے مگر گلابا ملاوٹ نہیں کرتا تھا۔ ہاں، اپنے گاہکوں سے خالص دودھ کے منہ مانگے دام وصول کرتا تھا اور گاہک خوشی سے اسے قیمت ادا بھی کرتے تھے۔

سورج نکلنے سے پہلے گلابا دودھ اکٹھا کرنے میں کام یاب ہو چکا تھا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اب وہ اپنے گھر آیا۔ اس کی بیوی نے ناشتا تیار کر لیا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ چنوں اور منوں...... وہ دونوں صحن میں کھیل رہے تھے۔ گلابے کو دیکھتے ہی وہ دونوں اس کی طرف دوڑے۔ گلابے نے ان دونوں کو ایک ساتھ گود میں اُٹھا لیا۔ انہیں پیار کیا۔ اب چنوں توتلی آواز میں بولا۔

''ابو...... ابو...... آپ سے دودھ کی مہک آتی ہے۔''

''میرے بیٹے...... کام جو ہوا۔'' گلابے نے ہنستے ہوئے انہیں نیچے اُتار دیا اور پھر ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ناشتے میں گھی کا پراٹھا، اچار اور لسی کا گلاس تھا۔ اب گلابے کی بیوی بولی۔

''بہت دن گزر گئے امی سے ملنے نہیں گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو امی سے مل آؤں۔''

''ہاں مل آؤ...... اور جلدی لوٹ آنا۔ تین بجے مجھے پھر سے دودھ اکٹھا کرنے کے لیے نکلنا ہے اور ہاں، بچوں کا خیال رکھنا۔''

''جی......'' گلابے کی بیوی تو خوش ہو گئی تھی۔

اب گلابا شہر کی طرف روانہ ہوا۔ مشرق میں سورج آنکھ کھول رہا تھا۔ موسم بہت سہانا تھا۔ اس کی کھٹارہ سائیکل چوں چراں کی آوازیں نکالتی آگے بڑھ رہی تھی اور گلابا کوئی لوک گیت گن گنا رہا تھا کہ ایسے میں وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنے سامنے سڑک پر دیکھا ایک موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ انہوں نے ایک تھیلا سڑک کنارے پھینکا اور پھر اپنی موٹر سائیکل گھما کر ہوا ہو گئے۔ جانے کیوں گلابے کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ اپنی کھٹارہ سائیکل پر ان لڑکوں کا تعاقب کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اب گلابے کو خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''جانے اس تھیلے میں کیا ہے؟'' گلابا اس رُخ پر سوچ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ اس تھیلے کے قریب ہو رہا تھا۔ اب وہ دیکھ رہا تھا۔ اس تھیلے میں حرکت کے آثار نظر آ رہے تھے اور تھیلے کا منہ اوپر سے بندھا ہوا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تھیلے میں کوئی زندہ چیز موجود ہے۔'' اب تو گلابا اور زیادہ ڈر گیا۔

''کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ سوچنے لگا۔ عجیب عجیب سے خیالات اس کے خوف میں اضافہ کرنے لگے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس تھیلے کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے نکل جائے۔ اسے کسی مصیبت میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے مگر پھر وہ رُک گیا۔

''ہو سکتا ہے کہ کسی کو میری مدد کی ضرورت ہو۔'' اس نے سائیکل کھڑی کر دی اور تھیلے کی طرف بڑھا۔

''ہو سکتا ہے کہ میری مدد سے کسی کی جان بچ جائے۔'' وہ تھیلے کے بالکل پاس آ کھڑا ہوا۔ تھیلے کی حرکت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ گلابے نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔ وہ تھیلے کا منہ کھولنا چاہتا تھا مگر جانے کیوں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے تھیلے کا منہ کھول دیا۔ ساتھ ہی وہ اُچھل کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اب ڈر کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔ تھیلے میں سے بلی کے بچے نکل رہے تھے چھوٹے چھوٹے...... پیارے پیارے...... گلابا ساری بات سمجھ گیا۔ شہر میں یہ بچے کسی کو تنگ کرتے ہوں گے۔ اس نے اپنی مشکل کا یہ علاج کیا تھا۔ بچوں کو تھیلے میں بند کر کے گاؤں کی حدود میں پھینک دیا تھا۔ ان بچوں نے گلابے کو گھیر لیا۔ انہیں گلابے سے دودھ کی مہک آ رہی تھی۔ وہ بھوکے تھے۔ گلابے کا دل پسیج گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف ٹوٹے گھڑے کی ٹھیکری پڑی تھی۔ اس نے ٹھیکری صاف کی اور اپنے برتن میں سے دودھ نکال کر ٹھیکری میں ڈال دیا۔ بلی کے بچے بے تابی کے ساتھ ٹھیکری میں موجود دودھ چاٹنے لگے۔ گلابے نے تھوڑا دودھ اور ڈال دیا۔

''اچھا بچو...... مجھے دیر ہو رہی ہے...... اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے بلی کے بچوں سے یہ بات کہی تھی۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ بھلا بلی کے بچے اس کی بات سمجھنے کے کب قابل تھے مگر ہاں گلابے نے یہ بات ضرور محسوس کی تھی کہ بلی کے بچے شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اب گلابا اپنی سائیکل پر سوار ہوا۔ شہر پہنچا، گھروں میں دودھ تقسیم کیا اور گاؤں واپس لوٹ آیا۔ واپسی کے سفر میں وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا تھا مگر اسے بلی کے بچے نظر نہیں آئے تھے۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی بیوی بچوں کے ہمراہ اپنی امی سے ملنے چلی گئی ہے۔ گلابے کے پاس تالے کی چابی موجود تھی۔ اس نے تالا کھولا۔ گھر میں داخل ہوا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی، دودھ والے برتن دھوئے اور پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ بہت میٹھی نیند آ رہی تھی۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ کسی بھی گوالے کی ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی نیند کبھی پوری نہیں ہوتی۔ جانے وہ کتنی دیر سویا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ تو کھل گئی تھی مگر حواس ابھی معطل تھے۔ دستک کے ساتھ ہی اس نے چنوں اور منوں کی آوازیں بھی سنیں تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس کے بیوی بچے لوٹ آئے تھے۔ وہ خمار کی حالت میں ہی دروازے کی طرف بڑھا اور پھر اس نے کنڈی گرا دی۔ بچے شور مچاتے گھر کے اندر داخل ہو گئے، پھر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ اپنے آنسو آنکھوں میں ہی سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔ گلابے کی آنکھوں میں موجود نیند اسی ایک پل میں اُڑن چھو ہو گئی۔ ''کیا ہوا......؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''وہ...... آج...... بچے۔'' وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہوا کیا؟'' گلابے کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

''میں بچوں کے ہمراہ بس سے اُتری۔ اب ہمیں سڑک عبور کرنا تھی۔ سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ میں انتظار کرنے لگی کہ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم کم ہو تو میں بچوں کے ہمراہ سڑک عبور کروں۔ ایسے میں مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ بچے میرے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑا کر سڑک کی طرف بھاگے۔ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ بچے سڑک کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ پھر میں نے دیکھا ایک تیز رفتار کار بچوں کو اپنی لپیٹ میں لینے ہی والی تھی کہ ایسے میں اچانک انسان کے روپ میں ایک فرشتہ آیا۔ اس نے بچوں کو اُٹھایا اور سڑک عبور کر گیا۔ آج ہمارے بچوں کو دوسری زندگی ملی ہے۔ جانے وہ اجنبی آدمی کون تھا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ ہماری کوئی نیکی ہمارے کام آ گئی۔''

گلابا سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا وہ ہر فکر سے آزاد صحن میں کھیل رہے تھے۔

''ہماری کوئی نیکی کام آ گئی۔'' گلابے کی آنکھوں کے سامنے غبار سا پھیل گیا۔ اس غبار میں اس نے دیکھا۔ کپڑے کا ایک تھیلا...... تھیلے میں بلی کے بھوکے بچے...... اس کا ان بھوکے بچوں کو دودھ پلانا...... وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ کون سی نیکی کام آئی ہے۔ اللہ پاک بہت مہربان اور رحیم ہے وہ اپنی ذات پر اپنی مخلوق کا قرض برداشت نہیں کرتا۔ فوراً ہی لوٹا دیتا ہے۔ پھر جانے گلابے کو کیا ہوا۔ وہ کھڑے کھڑے سجدہ شکر میں گر پڑا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اس کی بیوی حیرت سے گلابے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس نیکی سے انجان تھی جو گلابے نے راہِ خدا میں کی تھی اور گلابا راز کی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اللہ پاک اسی پر مہربان ہوتا ہے جو مخلوق پر مہربان ہوتا ہے۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

☆☆☆

ڈاکو مسلسل اس کی تاک میں تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ کسان دوسرا بیل لے کر آ رہا ہے تو انہوں نے نوجوان سے کہا۔

"نوجوان! اگر تم یہ دوسرا بیل بھی پہلے کی طرح اس کسان سے ہتھیا لو تو ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔" نوجوان فوراً رضامند ہوگیا۔

اس دفعہ اس نے ایک رسّی لی اور اپنے آپ کو کسان کے راستے میں ایک درخت کے ساتھ باندھ لیا۔ جب کسان بیل لے کر وہاں سے گزرا تو وہ ایک نوجوان کو اس طرح درخت سے بندھا دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا۔ وہ نوجوان دہائی دینے لگا۔

"اے رحم دل انسان! میری مدد کرو......"

کسان نے اس کی طرف دیکھا اور پھر محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"نوجوان! تمہیں یہاں کس نے باندھا ہے؟ میں ضرور تمہاری مدد کرتا مگر میں پہلے ہی اپنا ایک بیل کھو چکا ہوں، اس لیے اب رُک نہیں سکتا۔ مجھے جلدی بازار پہنچنا ہے۔"

یہ کہہ کر کسان بیل کو لے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی نوجوان نے اپنے آپ کو رسّی سے آزاد کیا اور خود جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا تیزی سے بھاگتا ہوا کسان سے آگے پہنچ گیا اور پہلے کی طرح اپنے آپ کو دوبارہ ایک درخت سے باندھ لیا۔ کسان جب وہاں پہنچا تو اس نوجوان کو درخت سے بندھا دیکھ کر بہت حیران ہوا اور بولا۔

"ارے، تم تو وہاں پیچھے اس درخت کے ساتھ بندھے تھے اور اب یہاں بھی موجود ہو۔ یہ کوئی جادو ہے یا تم کوئی بھوت ہو۔"

"میری مدد کرو......" نوجوان کراہا۔

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے بازار پہنچنے کی جلدی ہے جہاں مجھے یہ بیل فروخت کرنا ہے۔" کسان نے جواب دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اس کے جاتے ہی نوجوان نے پہلے کی طرح پھر اپنے آپ کو رسّی سے آزاد کیا اور دوبارہ کسان سے پہلے اس کے راستے پر آگے پہنچ گیا اور اپنے آپ کو تیسری بار پھر درخت سے باندھ لیا۔ کسان اس کو تیسری دفعہ یوں بندھے دیکھ کر چلّا اُٹھا۔

"تم یقیناً کوئی شیطان یا بھوت ہو، میں تمہیں پیچھے چھوڑ کر آتا ہوں اور تم پھر آگے آ موجود ہوتے ہو۔"

"میں کوئی بھوت نہیں ہوں۔ وہ دو نوجوان جو تم نے دیکھے ہیں، وہ میرے جڑواں بھائی ہیں۔ ہمارے دشمنوں نے ہمیں اس

طرح اس جنگل میں باندھ رکھا ہے۔مہربانی فرما کر ہماری مدد کرو۔''

کسان اس نوجوان کی بات سن کر تھوڑی دیر چپ رہا، کچھ سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔

''تم مجھے اس طرح بے وقوف نہیں بنا سکتے۔میں واپس جا کر دیکھتا ہوں، اگر وہ دونوں نوجوان اپنی جگہ موجود ہوئے تو تمہاری بات درست ہے، ورنہ تم میرے ساتھ کوئی فراڈ کر رہے ہو۔''

کسان نے جواب دیا اور پھر ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیل کو باندھا اور خود واپس پیچھے کی طرف بھاگا تا کہ ان دونوں نوجوانوں کی تصدیق کر سکے۔ اس کے جاتے ہی نوجوان نے خود کو بندشوں سے آزاد کیا اور بیل کی رسّی کھول کر وہاں سے چمپت ہوگیا۔ ڈاکو اس کی چالاکی پر ششدر رہ گئے۔ جب کسان کو پیچھے راستے پر کچھ نہ ملا تو وہ بھاگتا ہوا واپس آیا مگر اب وہاں نوجوان تھا، نہ ہی بیل۔ وہ ایک بار پھر اپنا سر پیٹنے اور رونے لگا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔

''اب تو یقیناً میری بیوی میرا سر پھاڑ ڈالے گی۔ اس سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ پہلے کی طرح گھر واپس جا کر وہاں سے تیسرا بیل لے آؤں اور اس کو بازار میں بیچ دوں تا کہ اس کی رقم اپنی بیوی کے حوالے کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا کر سکوں۔''

وہ دوبارہ گھر واپس گیا اور اپنی بیوی کو کچھ بتائے بغیر تیسرا بیل کھول کر لے آیا مگر ڈاکوؤں کو اس کی خبر تھی۔ انہوں نے نوجوان سے کہا۔

''اے نوجوان، تم نے پہلے دو بیل تو بڑی ہوشیاری سے اس کسان سے ہتھیا لیے ہیں مگر اب وہ کافی چوکنا ہے، اسے دھوکہ دینا مشکل کام ہوگا۔ اگر تم پہلے دو کی طرح تیسرا بیل بھی چرالو تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیں گے۔''

سرداری کے لالچ میں نوجوان اس بار بھی کسان کو دھوکہ دینے پر آمادہ ہوگیا اور فوراً جنگل میں پہنچ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ جب کسان اپنا تیسرا بیل لے کر اس کے قریب سے گزرا تو اس نوجوان نے بیل کی مانند آواز نکالی۔کسان نے یہ آواز سنی تو وہ ایک دم خوش ہوگیا۔ اسے لگا کہ یہ اس کے گمشدہ بیلوں کی آواز ہے جو یہیں کہیں جنگل میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔انہیں ڈھونڈنے کی اُمید میں اس نے اپنے تیسرے بیل کو ایک درخت سے باندھا اور خود جنگل کے اندر دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنے گمشدہ بیلوں کو تلاش کرنے لگا۔ اس دوران نوجوان اس کا تیسرا بیل بھی کھول کر لے گیا۔کسان نااُمید ہوکر واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر تقریباً پاگل ہی ہو گیا کہ اس کا تیسرا بیل بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ رونے پیٹنے لگا۔ اب تو وہ گھر واپس جاتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کیوں کہ اسے خطرہ تھا کہ اس کی بیوی یقیناً اس کا سر پھاڑ دے گی۔

دوسری طرف خود ڈاکو بھی اس نوجوان کی ذہانت سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسے اپنا سردار تو مان لیا مگر ساتھ ہی ساتھ اس سے جان چھڑانے کا کوئی راستہ بھی تلاش کرنے لگے۔ایک دو روز بعد جب سارے ڈاکو اپنی کسی نئی مہم پر گھر سے نکلے تو نوجوان ان کے ساتھ نہ گیا۔ وہ کوئی بہانہ بنا کر پیچھے رُک گیا۔ ڈاکوؤں نے اس کے ساتھ چلنے پر اصرار نہ کیا، وہ تو خود اس سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔

جب ڈاکو نظروں سے اوجھل ہو گئے تو نوجوان نے تینوں بیل کھولے اور انہیں ہانکتا ہوا اسی کسان کے گھر کی طرف چلا جس سے اس نے بیل ہتھیائے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے بیل کھلے چھوڑ دیئے اور خود دروازہ کھٹکھٹا کر وہاں سے کھسک گیا۔ اسے اُمید تھی کہ کسان باہر نکل کر اپنے بیل پہچان لے گا۔ واپس پہنچ کر اس نے ڈاکوؤں کے چند فالتو گھوڑے جو اصطبل میں کھڑے تھے، ان پر گھر میں پڑا ڈاکوؤں کا سب سونا چاندی اور قیمتی سامان لادا پھر بوڑھے نگران کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کمرے میں بند کیا، اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا۔

''اے نگران! ڈاکوؤں کو بتا دینا کہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ وہ اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔''

یہ کہہ کر وہ ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور ساز و سامان سے لدے باقی گھوڑوں کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ جب ڈاکو واپس آئے اور انہیں سب خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے قیمتی سامان کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ ہی نوجوان کا پیچھا کیا بلکہ انہوں نے شکر ادا کیا کہ اتنے خطرناک ٹھگ سے ان کی جان چھوٹ گئی ہے۔

☆

ڈاکوؤں سے چھینا ہوا سارا قیمتی سامان اور گھوڑے لے کر وہ نوجوان اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے ایک جگہ گھوڑوں کو روکا اور ان پر لدے سامان میں موجود

کپڑوں سے ایک شاندار قیمتی جوڑا نکالا اور اس کو پہن لیا۔ ان کپڑوں میں وہ امیر کبیر تاجر نظر آ رہا تھا۔اس کے بعد اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ جب اس کا بوڑھا باپ باہر نکلا تو وہ اپنے بیٹے کو اس قیمتی لباس میں بالکل بھی پہچان نہ پایا اور سوالیہ نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا مجھے اس گھر میں رہنے کے لیے ایک کمرہ مل جائے گا۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میرا گھر آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔''بوڑھے نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا اپنے بیٹے کے لیے بھی آپ کے ہاں جگہ نہیں ہے؟'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نوجوان کی اس بات پر بوڑھے نے بہت غور سے اسے دیکھا تو وہ اسے پہچان گیا۔

''ارے،تم تو واقعی میرے بیٹے ہو......مگرتم نے اتنی جلدی، اتنی زیادہ دولت کیسے کمالی؟'' بوڑھے نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بابا! آپ نے کہا تھا کہ میں اپنی مرضی کا کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتا ہوں جس سے دولت کمائی جا سکے۔ اس لیے میں نے چوروں اور ٹھگوں کے ہاں ملازمت کر لی اور وہاں ترقی کر کے میں ان کا سردار بن گیا اور وہاں سے یہ دولت کما کر اب گھر واپس آ گیا ہوں۔'' نوجوان نے مختصراً ساری بات بتا دی۔

اس کے بعد اس نے سارا قیمتی سامان گھر کے اندر منتقل کیا اور بازار جا کر سارے گھوڑے فروخت کر کے نقد رقم حاصل کر لی۔

''اب تم کیا کام کرو گے؟'' بوڑھے باپ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ اب میرے پاس بہت دولت ہے، ضرورت پڑنے پر میں اس رقم سے تجارت کا پیشہ اختیار کر سکتا ہوں۔'' نوجوان نے وضاحت کی۔

بوڑھے کی جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر گاؤں کے زمیندار کی عالی شان حویلی تھی جس میں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس زمیندار کی ایک ہی بیٹی تھی جو بہت قابل اور خوب صورت تھی۔ نوجوان اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے بوڑھے باپ سے کہا۔

''بابا! آپ زمیندار کے گھر جائیں اور اس کی بیٹی سے میری شادی کی بات کریں۔''

''ارے لڑکے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا...... اگر وہ پوچھے کہ لڑکے کا کاروبار کیا ہے تو میں اس کو کیا جواب دوں گا؟'' باپ نے غصے سے کہا۔

''صاف بتا دینا کہ میں چوریاں کرتا تھا اور اعلیٰ قسم کا ٹھگ تھا۔'' لڑکے نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''لگتا ہے تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے۔'' بوڑھے نے غصے سے کہا۔''مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں جا کر زمیندار سے یہ سب باتیں کر سکوں، وہ بہت قابلِ عزت انسان ہے۔'' ☆☆☆

(باقی آئندہ)

عمر بھر یوں ہی غلطی کرتے رہے غالب
دھول چہرے پر تھی اور آئینہ صاف کرتے رہے

(ثانیہ امتیاز، لاہور)

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

(عائشہ امتیاز، لاہور)

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں

(احور کامران، لاہور)

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

(سمیعہ توقیر، کراچی)

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

(حفصہ نعیم، کراچی)

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

اپنی جاں نذر کروں، اپنی وفا پیش کروں
قوم کے مردِ مجاہد تجھے کیا پیش کروں؟

(صباحت فاطمہ، اوکاڑہ)

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

(محمد عثمان غنی، فروکہ)

پھر سے غاروں میں چھپ گئی چڑیا
شہر کے حادثات سے ڈر کے

(عبدالرحمٰن، قصور)

میری ماں کی دعاؤں سے پریشان ہے میرا دشمن
وہ جب بھی وار کرتا ہے تو خنجر ٹوٹ جاتا ہے

(خنساء حسینی، کلورکوٹ)

سدا ایک رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی

(شیرونیہ ثناء، حیدرآباد)

مطمئن ہو دل تو پھر صحرا کے سناٹے بھی گیت
دل اجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائی بہت

(نجم السحر، ملک وال)

ہنسی آتی ہے مجھے حسرتِ انسان پر
گناہ کرتا ہے خود، لعنت بھیجتا ہے شیطان پر

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

(فاکہہ خالد راؤ)

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشۂ و سنگِ گراں ہے زندگی

(محمد سلمان خالد راؤ)

ایک دن میں کھیتوں کے قریب صنوبر کے درختوں کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ گاؤں کی طرف سے چند مردوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی، مڑ کر دیکھا تو تین چار آدمی میری طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کی عورتیں بھی تھیں۔ سب سے آگے احسان تھا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو زور سے چلایا۔ ''بابو جی........ بابو جی........ غضب ہو گیا بابو جی۔''

''کیا ہوا احسان؟'' میں نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

''وہی ہوا جو تین مہینے سے ہو رہا ہے۔''

احسان کا رنگ سرخ اور رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے سائے میں بٹھایا اور پانی پلایا۔ جب سانس ذرا درست ہوئی تو میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا؟''

''گھابرو نے ایک اور آدمی کو مار دیا ہے۔''

''اُف، میرے خدایا!'' میں نے کہا۔ ''یہ کوئی آسمانی بلا ہے جو ہم پر نازل ہوئی ہے، اب کس کی زندگی گئی ہے؟''

''جمیل کی۔'' احسان نے بتایا۔ ''جمیل بے چارہ مر گیا ہے۔''

''مجھے ساری تفصیل بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

احسان نے ایک مرتبہ اور پانی پیا اور پھر جمیل کی موت کی تفصیل بیان کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب سے کوئی تین گھنٹے پہلے جمیل گھاس کاٹنے کے لیے جنگل میں گیا۔ کافی دیر تک جب وہ نہ آیا تو اس کے والد کا ماتھا ٹھنکا۔ پہلے کبھی ایسے نہیں ہوا تھا کہ جمیل نے اس کام میں اتنی دیر لگائی ہو۔ چناں چہ اس کا والد پانچ سات نوجوانوں کو ساتھ لے کر اسے ڈھونڈنے نکلا۔ یہ سب لوگ لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ اگرچہ یہ ہتھیار گھابرو کی طاقت کے سامنے کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے لیکن پھر بھی انسان کی فطرت ہے کہ اس کے پاس معمولی سا بھی ہتھیار ہو تو وہ اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کرتا ہے۔

گاؤں کے باہر کھیت تھے جن کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ساری پارٹی جنگل میں داخل ہوئی۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ہی انھیں جمیل کی لاش مل گئی لیکن اس حالت میں تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ جمیل کی پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، چہرہ پچک چکا تھا، جسم خون سے بھرا ہوا تھا اور بازو اور ٹانگیں مُڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کار نے اسے بار بار ٹکریں مار کر اس کا یہ حال کیا ہے لیکن وہاں کار کہاں تھی؟ سب سمجھ گئے کہ یہ گھابرو کی کارستانی ہے۔

گاؤں والوں کو یہ ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اکیلا جنگل میں جائے اور گھابرو کا شکار ہو جائے لیکن جمیل کے ساتھ یہی سب کچھ ہوا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ جان تو اس کی چلی گئی تھی۔

میں نے تھوڑی دیر احسان کی بات سنی پھر رائفل سنبھال کر گاؤں کی طرف چل دیا اور ویسے بھی اس وقت تک جمیل کی لاش گھر آ چکی تھی اور عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

☆

میں پنجاب یونی ورسٹی میں ایم اے انگلش کا طالب علم ہوں اور وہیں ہوسٹل میں رہتا ہوں۔ اس مرتبہ چھٹیوں میں گھر آیا تو حیران رہ گیا۔ سارے گاؤں پر اُداسی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ہر شخص غمگین اور ڈرا ڈرا سا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ گھابرو نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔

''یہ گھابرو کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''صاحب گھابرو ایک پہاڑی بکرا ہے۔'' عبدالرشید دُکان دار نے بتایا۔

''یہ عام بکروں سے بہت مختلف ہے، بہت بڑے جثے کا ہوتا ہے، بالکل بھینسے جیسا، بڑا ہی ظالم۔ جس کو دیکھتا ہے سینگ مار مار کر ہلاک کر دیتا ہے، سب ڈرتے ہیں اس سے۔''

جب میں نے مزید تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ گھابرو ایک مارخور بکرا ہے جو ان دنوں بہت بدمست ہوا ہے، یہ ساری تباہی اسی کی مچائی ہوئی ہے۔

مارخور فارسی زبان کا لفظ ہے۔ مارخور کا مطلب ہے، سانپ کھانے والا۔ یہ پاکستان کا قومی جانور ہے اور گلگت اور اردگرد کے علاقوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ لوگ اس کا شکار بھی کرتے ہیں اور گوشت بھی کھاتے ہیں۔

گھابرو بھی ایک مارخور بکرا تھا لیکن ایسا دہشت ناک اور بے رحم کہ لوگوں نے اس کا نام ہی گھابرو رکھ چھوڑا تھا یعنی ''گھبراہٹ پیدا کرنے والا۔''

اس کا قد کاٹھ عام بکروں سے دوگنا اور سینگ بھی خوب لمبے اور مُڑے ہوئے تھے، اور ایسا ظالم کہ جسے دیکھ لیتا جان لیے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ وہ کئی ماہ سے ہمارے گاؤں میں وارداتیں کر رہا تھا۔

اس کا سب سے پہلا شکار ایک گائے تھی۔ گاؤں کے باہر ماجی خان کا باڑا تھا جس میں جانور بندھے رہتے تھے۔ گھابرو ایک مرتبہ دروازہ توڑ کر اندر آ گیا۔ سینگ مار مار کر ایک گائے کو ہلاک کر دیا۔

اس کے چند دن بعد کا واقعہ ہے کہ ایک چرواہا اپنی بکریاں ہانکتا ہوا ہمارے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ گھابرو ایک چھوٹی سی پہاڑی کی اوٹ سے نکلا اور بپ بپ کرتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔ چرواہے کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ اس نے اسی سے گھابرو کا مقابلہ کیا لیکن طاقت ور سینگوں کے آگے لاٹھی کی بھلا کیا اوقات تھی؟ نتیجے کے طور پر چرواہے کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اس واقعے نے سارے گاؤں کو فکر میں مبتلا کر دیا۔ ہر شخص حیران تھا کہ یہ بلا آخر آئی کہاں سے؟ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ یہ بکرا اوپر کے پہاڑوں سے اُتر کر گاؤں کی طرف آ گیا ہے اور ایسا اکثر ہوتا بھی تھا۔

بہرحال گھابرو نے اگلے دو مہینوں میں دو شکار اور کر لیے۔ یہ دونوں آدمی مختلف وقتوں میں جنگل کی طرف گئے لیکن زندہ واپس نہ آئے۔

اب تو گاؤں والوں نے باقاعدہ ڈرنا شروع کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی گلیاں سنسان ہو جاتیں۔ رات کی نماز میں نمازی بہت کم ہوتے کسی شخص کو کہیں جانا ہوتا تو کلہاڑی لے کر جاتا یا پھر گروپ کی شکل میں جاتا۔

گاؤں والوں نے اس کی ہلاکت کے لیے محکمہ جنگلات کو درخواست بھی دی تھی لیکن ابھی تک کچھ نہ ہوا تھا۔ مجھے یہ ساری صورت حال الگ پریشان کر رہی تھی۔ ایسا تو آج تک نہ ہوا تھا۔ پہلی رات تو مجھے نیند ہی نہیں آئی، میں ساری رات سوچتا رہا کہ آخر اس بلا سے کیسے نبٹا جائے۔ آخر صبح اُٹھ کر صندوق میں سے چچا کی رائفل نکالی اور اسے صاف بھی کر لیا۔ میرے چچا ایک ماہر شکاری تھے اور ان کی رائفل اس معاملے میں بڑے بھروسے کی چیز تھی۔

اگلے دن گاؤں کے بڑوں کے مشورے سے یہ طے پایا، چوں کہ رائفل میرے پاس ہے، اس لیے میں ہی گھابرو کو تلاش کر کے اسے ہلاک کروں۔

میں نے چند نوجوانوں سے مدد کی درخواست کی لیکن وہ سب مناسب بہانے بنا کر ایک طرف ہو گئے۔ دراصل گھابرو کی دہشت ہی اتنی تھی کہ کسی کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخرکار میں نے خود ہی اس مشکل کام کو انجام دینے کا بیڑا اُٹھایا۔ میں سارا دن رائفل تھامے پہاڑوں میں آوارہ گردی کرتا پھرتا لیکن گھابرو سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں صبح سویرے نکلتا اور شام کو تھک ہار کر واپس آ جاتا۔ اس دوران کوئی نئی واردات بھی نہ ہوئی۔ میں سمجھا شاید گھابرو یہ علاقہ چھوڑ کر اوپر پہاڑوں میں واپس چلا گیا ہے لیکن شاید یہ میری بھول تھی۔

اگلے ہی دن گھابرو نے ایک واردات اور کر ڈالی۔

چاچا کرمو صبح کے وقت اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا کہ نہیں معلوم گھابرو کہاں سے نکل آیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ چاچے کو اس کا پتا اس وقت چلا جب اسے اپنی کمر پر ایک زوردار ٹکر لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو گھابرو اپنی متکبرانہ شان کے ساتھ کھڑا تھا جیسے پوچھ رہا ہو: ''کیوں چاچا! مزہ آیا؟''

چاچے کی قسمت اچھی تھی جو اس کے ہاتھ میں درانتی تھی۔ اس نے وہی گھما کے ماری، وار خالی گیا اور درانتی کا پھل گھابرو کی کھال کو چھوتے ہوئے نکل گیا۔ اس صدمے سے وہ گھبرایا ضرور لیکن پچھلی ٹانگوں پر گھوم کر واپس آ گیا۔

چاچے کے لیے اتنا موقع بہت تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر دُور ہو گیا اور زمین سے پتھر اُٹھا لیے۔ گھابرو پھر حملہ آور ہوا۔ چاچے نے اس کا پتھروں سے مقابلہ کیا اور پھر جھکائی دینے میں کام یاب ہو گیا۔

اتنے میں دوسرے کھیتوں سے کسان اکٹھے ہو گئے اور لگے شور مچانے۔ گھابرو تھوڑی دیر اس شور شرابے کو دیکھتا رہا، پھر واپس لوٹ گیا۔ یوں بے چارے چاچے کی جان بچی۔

مجھے جیسے ہی ساری بات کا پتا چلا، میں فوراً موقع پر پہنچا۔ کرمو کا سانس اُکھڑا ہوا تھا لیکن وہ ہوش و حواس میں تھا۔ مجھے یہ آسانی سے معلوم ہو گیا کہ گھابرو سبز پہاڑیوں کی طرف نکلا ہے۔ ابھی دن تھا اور مجھے یہ اُمید تھی کہ میں آسانی سے اپنے شکار کو پا لوں گا، لہٰذا میں فوراً سبز پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوا۔

گاؤں کے شمال میں چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان پر جھاڑیاں بہت کثرت سے ہیں، اس لیے گاؤں والے انہیں سبز پہاڑیاں کہتے ہیں۔ میں جب اس علاقے میں داخل ہوا تو سورج سر پر تھا لیکن گرمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں پوری طرح چوکنا تھا اور رائفل پر میری گرفت مضبوط تھی کیوں کہ کسی بھی لمحے گھابرو سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

ایک موڑ مُڑ کر جیسے ہی میں ذرا سامنے ہوا تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ راستے کے درمیان گھابرو کھڑا اپنی قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جیسے ہی میری نظریں اس سے چار ہوئیں جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُف، میرے خدایا! یہ بکرا تھا یا کوئی بلا؟ لوگوں نے صحیح اس کا نام گھابرو رکھا تھا۔ بھینسے جیسا قد، بالوں بھری جلد، لال انگارہ آنکھیں اور اوپر سے مُڑے ہوئے سینگ، وہ راستے کے درمیان ایسے تن کے کھڑا تھا جیسے میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔

وہ وقت ہمت کا تھا، چناں چہ میں نے پوری توجہ سے رائفل سیدھی کی اور اس کا بٹ کندھے سے لگا لیا۔ اب میں فائر کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ دوسری طرف گھابرو نے اپنا دایاں کھر زمین پر مارنا شروع کیا جو اس کے حملہ کرنے کی علامت تھی۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت کم شکار کھیلا ہے لیکن جب بھی کبھی اس کا موقع آیا میں نے بزدلی نہیں دکھائی۔ میرا ایمان ہے کہ موت ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے تو پھر کیوں ڈر ڈر کر زندگی گزاری جائے۔

اس وقت بھی میں تن کر کھڑا تھا اور میرے دل میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔

گھابرو نے اپنا سر نیچا کیا اور سینگ اوپر اُٹھا کر میری طرف حملہ آور ہوا۔ فاصلہ دس گز سے زیادہ کا نہ تھا۔ میں بھی پوری طرح تیار تھا۔ میں نے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی گردن میں لگی۔ میں نے ساتھ ہی دوسرا ٹریگر دبا دیا۔ یہ گولی بھی وہیں لگی۔ میں نے تیسرا اور چوتھا ٹریگر بھی دبا دیا۔ چاروں گولیاں اس کی گردن میں لگیں اور گردن پھاڑتی ہوئی نکل گئیں۔ گھابرو دھڑام سے زمین پر گرا اور ذرا سا ہلنے کے بعد پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بات اس کی بے پناہ قوت کو ظاہر کرتی تھی۔

چار گولیاں چلانے کے بعد پانچواں فائر کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں دم بخود کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ گھابرو کھڑا ہو کر ذرا سا لڑکھڑایا اور پھر گر گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

میں وہیں کا وہیں کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آتا تھا کہ میں نے اس بلا کو شکار کر لیا ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر میں وہیں کھڑا رہا اور پھر اس کے قریب جائے بغیر گاؤں کی طرف چلا گیا۔

گاؤں والوں کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو انہوں نے خوشی میں بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ ہر شخص مجھے شاباش دے رہا تھا اور ہر شخص میری تعریف کر رہا تھا جب کہ میں اس بات پر حیران تھا کہ اس میں میرا کیا کمال ہے؟ میں تو ایک عام سا طالب علم ہوں۔ یہ سب تو قدرت کی مہربانی سے ہوا ہے۔ بہرحال گاؤں والوں کو اس کی بڑی خوشی تھی کہ گھابرو سے نجات مل گئی جب کہ میں اس بات پہ خوش تھا کہ مفت میں گاؤں کا ہیرو بن گیا۔ ☆☆☆

(**بقیہ: نیکی یا بیگار**) میں خوش تھا کہ اس بہانے مجھے اسکول سے کچھ دن کے لیے چھٹی ہو جائے گی۔ بارہ بجے دوپہر کو بس روانہ ہوئی۔ وقفے وقفے سے سواریاں اُترتی اور سوار ہوتی رہیں۔ ابھی تقریباً آدھا سفر طے ہوا تھا کہ ایک بھاری بھر کم خاتون ایک گٹھڑ سر پر رکھے بس میں سوار ہوئی۔ اس کی گود میں سال ڈیڑھ سال کا بچہ بھی تھا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میرے اندر نیکی کے جذبے نے جوش مارا اور میں نے اپنے آپ کو سکیڑ کر خاتون کے لیے جگہ بنائی۔ وہ مسافروں کے درمیان سے راستہ بناتی میری سیٹ تک پہنچی۔ گٹھڑ میرے پاؤں میں رکھا اور ٹھسم ٹھس ہو کر ساتھ بیٹھ گئی۔ گرمیوں کا موسم تھا اور اس کے گرد اور مٹی سے اٹے کپڑے بو کے بھبھکے خارج کر رہے تھے ابھی میں اپنی نیکی پر کڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے اونگھتا بچہ میری گود میں یہ کہہ کر ”اسے ذرا پکڑو، میں تھوڑا سیدھی ہو لوں۔“ دے دیا۔

گود میں آتے ہی بچے نے جماہی لی اور پیشاب کی دھار چھوڑ دی۔ تاہم خاتون بے نیازی سے گٹھڑ کھولنے میں لگی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔ گٹھڑ میں بندھی الا بلا کو اوپر نیچے کرنے کے بعد وہ مری ہوئی آواز میں میری طرف دیکھ کر بولی۔

”نہ جانے کرایہ کہاں چلا گیا؟“

نیکی کی لاج نبھانے کی خاطر میں نے اس کا کرایہ دے دیا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ ہم دونوں کی منزل ایک تھی۔

خدا خدا کر کے سورج ڈوبنے پر ہمارا سٹاپ آیا اور مجھے اس پر تسمہ پا جیسی نیکی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال بہت خوش گوار لگا لیکن...... ابھی میری نجات ممکن نہیں تھی۔ بس سے اُترتے ہی خاتون نے میرے پوچھے بغیر گٹھڑ میرے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے بچہ اٹھایا ہوا ہے...... تم ذرا گٹھڑی اٹھا لو...... بس دو گلی پر میرا گھر ہے۔“

مرتا کیا نہ کرتا۔ گٹھڑ سر پر رکھے میں خاتون کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور میں کٹی ہوئی فصل والی کھیتوں میں سے، ڈنٹھلوں سے پاؤں زخمی کراتے اور ہل چلاتی زمینوں کی نرم مٹی میں دھنستے، توازن کھوتے اور اپنے آپ کو کوستے چلا جا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے خاتون کا گھر آیا۔ میں نے گٹھڑ اس کے دروازے پر پھینکا اور پیچھے دیکھے بغیر کھالوں اور کھیتوں کی منڈیروں پر سے گرتا پڑتا بہن کے گھر پہنچا۔

بہن نے میری بپتا سنی تو ناراض ہوئی۔ تاہم اس نے مجھے اتنی نصیحت کی کہ ”نیکی کرنا اچھی بات ہے لیکن بیگار سہنا اچھا کام نہیں۔“

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

ڈاکٹر ایڈورڈ جینر

فرانس کا مشہور بادشاہ نپولین ایک رات اپنی ملکہ کے کمرے میں داخل ہوا تو ملکہ بیٹھی خط پڑھ رہی تھی۔

"کس کا خط ہے؟" نپولین نے ملکہ سے سوال کیا۔ ملکہ نے خط شہنشاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر ایڈورڈ جینر (Edward Jenner) کا۔ اس نے آپ سے درخواست کی ہے کہ انگریز قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔" نپولین تھوڑی دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "ڈاکٹر جینر نے دُنیا والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کی بات ٹالی نہیں جا سکتی۔" دوسرے دن انگریز قیدی رہا کر دیئے گئے۔

واقعی ڈاکٹر جینر نے دُنیا والوں پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس نے چیچک کا ٹیکہ ایجاد کیا تھا اور لاکھوں آدمیوں کو ایک بھیانک اور موذی مرض سے بچالیا تھا۔

ایڈورڈ جینر انگلستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ پادری تھا۔ ننھے ایڈورڈ کو گاؤں کی زندگی بہت پسند تھی اور وہ دن بھر آس پاس کے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اسے قدرتی چیزوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر جنگلی پھول، جھاڑی اور درخت کا نام جانتا تھا اور وہ پرندوں کی آواز سن کر بتا دیتا تھا کہ فلاں پرندہ بول رہا ہے۔

ایڈورڈ جینر بڑا ہوا تو شاعری کرنے لگا مگر اس کا باپ چاہتا تھا کہ ہونہار ایڈورڈ ڈاکٹر بنے۔ اس نے بیٹے کو تعلیم کے لیے برسٹل شہر کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ ایک دن وہ چیچک کی بیماری کا حال پڑھ رہا تھا کہ اسے اپنے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی ایک بات یاد آگئی۔ اس نے بچپن میں ان لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ اگر کسی آدمی کو گائے کے تھن میں ہونے والی (گؤتھن سیتلا) چیچک لگ جائے تو پھر اسے چیچک کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس نے سوچا بزرگوں کی اس بات میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہوگی۔ لہٰذا اس کی کھوج لگانی چاہیے۔ اس نے اپنے اُستادوں سے پوچھا، شہر کے ڈاکٹروں سے بات چیت کی مگر ہر شخص نے اس کی بات کو ہنسی میں اُڑا دیا۔ دیہات کے جاہل گنواروں کی باتوں کو سائنس سے کیا واسطہ؟ لیکن جینر کو تسلی نہیں ہوئی۔

برسٹل سے فارغ ہو کر وہ لندن چلا گیا اور جان ہنٹر جیسے نامی گرامی ڈاکٹر کی نگرانی میں اپنی تعلیم مکمل کرنے لگا۔ لندن میں اسے یہ پتا چلا کہ ایشیاء کے بعض ملکوں میں لوگ چیچک سے بچنے کے لیے چیچک کا تھوڑا سا مواد اپنے خون میں داخل کر لیتے ہیں۔ اس طرح انہیں چیچک نکلتی تو ہے مگر بہت ہلکی سی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چیچک کا مواد ہی انسان کو چیچک سے بچا سکتا ہے۔

ایڈورڈ جینر نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا تو اس کے اُستاد جان ہنٹر نے اسے مشورہ دیا کہ اگر تم لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو اپنے گاؤں واپس جاؤ۔ وہیں اپنا مطب کھولو اور فرصت کے وقت چیچک کے تجربے بھی کرتے رہو۔ لندن میں تو تمہیں گائے دیکھنے کو بھی نہ ملے گی۔ پھر تم اس کے تھن پر سیتلا کے جو دانے نکل آتے ہیں، ان کی جانچ کیسے کر سکو گے۔ ڈاکٹر جینر نے اُستاد کی بات مان لی اور اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔

سال گزرتے رہے مگر ڈاکٹر جینر دھن کا ایسا پکا تھا کہ اس نے ہار نہ مانی۔ وہ برابر تجربے کرتا رہا۔ کتابیں پڑھتا رہا۔ آخر بیس سال کی لگاتار محنت کے بعد اس نے چیچک کا ٹیکہ تیار کر لیا اور ایک دن اس نے یہ ٹیکہ آٹھ سال کے ایک بہادر بچے پر آزمایا۔ اس لڑکے کا نام جیمز فلپس تھا۔ اس نے پہلے تو اس لڑکے کو گئوتھن سیتلا کے مواد کا ٹیکہ دیا، پھر ڈیڑھ ماہ بعد چیچک کے مواد کا ٹیکہ دیا۔ ڈاکٹر جینر کے ان تجربوں پر بڑا شور مچا۔ ''ڈاکٹر جینر ایک معصوم بچے کی زندگی سے کھیل رہا ہے۔''

''ڈاکٹر جینر گنواروں کی باتوں میں آ کر سائنس کی توہین کر رہا ہے۔''

''ڈاکٹر جینر قدرت کے معاملات میں دخل دے رہا ہے۔''

غرض اس پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی مگر ڈاکٹر جینر کو اپنے تجربوں پر پورا بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے کو چیچک ہرگز نہیں نکلی۔ ڈاکٹر جینر نے اب ایک ایسے آدمی کو چیچک کے مواد کا ٹیکہ دیا جس کو اس سے پہلے گئوتھن سیتلا کے مواد کا ٹیکہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس آدمی کو چیچک نکل آئی۔ ڈاکٹر جینر کا تجربہ کامیاب رہا۔

اب تو سارے ملک میں ڈاکٹر جینر کے ٹیکے کی دھوم مچ گئی۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ڈاکٹر جینر کو بیس ہزار پونڈ کا انعام دیا جو آج کل کے دس لاکھ روپے کے برابر ہوگا۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی نے اسے ڈاکٹری کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ڈاکٹر جینر کی شہرت یورپ پہنچی تو روس کے بادشاہ نے اسے سونے کی انگوٹھی بھیجی۔ نپولین نے اسے تعریف کا خط لکھا اور امریکہ سے بہت سے لوگ ڈاکٹر جینر کی شکل دیکھنے آئے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیوں کہ ڈاکٹر جینر نے اپنی ایجاد سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جان بچا لی۔ ڈاکٹر جینر کی ایجاد سے پہلے ایک سو سال میں یورپ میں چھ کروڑ آدمی چیچک سے مرے تھے۔ اب یورپ میں شاید ایک آدمی بھی چیچک سے نہیں مرتا۔

ڈاکٹر جینر کو کئی آدمیوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنا نسخہ کسی دوسرے کو نہ بتائے، بلکہ اپنے ٹیکے کو خفیہ رکھے تو اس کو گھر بیٹھے دو لاکھ روپے سال کی آمدنی ہو جائے گی مگر ڈاکٹر جینر نے جواب دیا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا کام انسانوں کی جان بچانا ہے۔ میں سوداگر نہیں ہوں۔ چناں چہ اس نے اپنے ٹیکے کا نسخہ اخباروں میں چھاپ دیا تا کہ دُنیا میں ہر جگہ لوگ اس دوا سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس وقت ڈاکٹر جینر کی عمر 49 سال تھی۔

ڈاکٹر جینر کے پاس دولت بھی تھی اور شہرت بھی مگر انہوں نے دیہات میں اپنا مطب نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے بہت کہا کہ اب آپ اتنے مشہور ہو گئے ہیں، لندن چلے جائیں تو وہاں آپ کا مطب خوب چلے گا لیکن ڈاکٹر جینر اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ''مجھے جو کچھ ملا ہے، اسی دیہاتی زندگی کی بدولت ملا ہے، پھر میں اسے کیوں چھوڑوں۔ یوں بھی لندن میں سینکڑوں ڈاکٹر موجود ہیں لیکن میرے قصبے میں تو کوئی دوسرا ڈاکٹر نہیں ہے جو میرے بعد غریبوں کا علاج کر سکے۔''

چیچک کا ٹیکہ اب تو بہت سستا ہو گیا ہے اور آسانی سے ہر جگہ مل جاتا ہے لیکن آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے چیچک کا ٹیکہ بہت مہنگا تھا مگر ڈاکٹر جینر نے روپے کا لالچ کبھی نہیں کیا۔ وہ غریبوں کو چیچک کا ٹیکہ مفت لگاتے تھے۔ اسی لیے ان کے مطب میں صبح سے شام تک بھیڑ لگی رہتی تھی۔

ڈاکٹر جینر کو اپنے بیوی بچوں سے بڑی محبت تھی، ان کی بیوی اسی علاقے کی رہنے والی تھیں اور اپنے شوہر کی مانند دیہاتی زندگی کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ڈاکٹر جینر کو اپنی بیوی سے اتنا پیار تھا کہ اگر وہ ایک دن کے لیے بھی کسی کام سے لندن جاتے تو ان کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ آخر عمر میں ڈاکٹر جینر کو کئی صدمے برداشت کرنے پڑے۔ پہلے ان کا بڑا بیٹا مرا، اور پھر ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کی موت نے انہیں دُنیا کی ساری خوشیوں سے محروم کر دیا۔ ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ پھر اپنے گاؤں سے باہر نہ نکلے۔ ''یہاں کے ہر درخت، ہر جھاڑی اور ہر پھول سے مجھے اپنی بیوی کی خوشبو آتی ہے۔'' وہ کہا کرتے۔

چند سال بعد جنوری کی ایک ٹھنڈی صبح کو ان پر فالج گرا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر جینر کو اس دُنیا سے رخصت ہوئے 138 برس ہو چکے ہیں، لیکن ان کا نام رہتی دُنیا تک روشن رہے گا کیوں کہ انہوں نے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو چیچک کے مہلک مرض سے نجات دلائی اور ساری عمر غریبوں کی خدمت کرتے رہے۔ ☆☆☆

سائیکلنگ...... دُنیا کا مقبول ترین اور قدیم ترین کھیل ہے۔ امریکہ میں سائیکلنگ وزن گھٹانے اور بھوک بڑھانے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ جب کہ فرانس اور چین میں اب بھی لوگ بہت بڑی تعداد میں سائیکل کا استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ سائیکل کو فرانس کی ایجاد بھی کہا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ 1790ء میں فرانس سے تعلق رکھنے والے ایک شخص ایم ڈی سوراک نے سائیکل ایجاد کی۔ اس کی ابتدائی شکل لکڑی کے گھوڑے کی طرح تھی۔ اس میں لکڑی کے دو پہیے، ایک پھٹے کے ذریعے آپس میں جوڑ دیئے گئے تھے۔ اس ابتدائی شکل میں کوئی ہینڈل یا پیڈل نہیں تھا۔ یہ سائیکل سوار کے لیے ایک مشکل صورت حال تھی۔ کیوں کہ اسے پھٹے پر درمیانی حصے پر بیٹھ کر پیروں کی مدد سے اسے دھکیلنا پڑتا تھا۔ 1818ء میں مزید پیش رفت ہوئی اور ایک جرمن نے اس پر بیٹھنے کے لیے ایک گدی اور ہینڈل کا اضافہ کر دیا۔ انگلستان اور فرانس میں 1850ء کے بعد سائیکل کی پہلی شکل وضع کی گئی۔ امریکہ میں 1866ء میں دو پہیوں والی سائیکل لائی گئی۔ 1888ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک رہائشی نے موجودہ سائیکل کی شکل تیار کی۔ 1891ء میں ربڑ کے ٹائر، ٹیوب والی سائیکل پہلی بار دوڑ میں شامل ہوئی۔

سائیکلنگ کو پہلی مرتبہ 1896ء کے جدید اولمپکس میں شامل کیا گیا۔ یہ مقابلے یونان کے شہر ایتھنز میں ہوئے تھے۔ اس ابتدائی سائیکل ریس کا فاصلہ ایک سو کلو میٹر یا ٹریک کے تین سو چکروں کے برابر تھا۔ فرانسیسی سائیکلسٹ "فیلماند" نے تین گھنٹے، آٹھ منٹ اور انیس اعشاریہ دو سیکنڈ میں یہ ریس جیتی۔ فرانس کے ہی پال میسن نے اسی اولمپک میں اوپر تلے تین طلائی تمغے جیت کر ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔

1900ء میں فرانس نے غیرسرکاری چیمپئن شپ جیتی۔ 1904ء میں سائیکلنگ مشکلات کا شکار ہوئی۔ کیوں کہ پیشہ ور کھلاڑیوں کی شرکت کی وجہ سے سائیکلنگ کو "آفیشل" تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد سائیکلنگ کا کھیل آہستہ آہستہ مقبول ہوتا گیا۔ 1908ء کے اولمپکس میں انگلستان کو برتری حاصل رہی۔ 1912ء میں میزبان سویڈن کا پلہ بھاری رہا۔ 1920ء کے اولمپکس میں بھی انگلستان کا ہی غلبہ رہا۔ 1924ء کے پیرس اولمپکس میں فرانس آگے رہا۔ 1928ء کے ایمسٹرڈیم اولمپکس میں ہالینڈ، 1932ء کے لاس اینجلس میں ہونے والے اولمپک مقابلوں میں اٹلی فاتح رہا۔ جب کہ 1936ء کے اولمپک مقابلوں میں بھی اٹلی ہی کو برتری حاصل رہی۔ 1948ء کے اولمپک مقابلوں کے

بعد سائیکلنگ کے مقابلوں میں تبدیلی لائی گئی۔

تیز ترین سائیکل چلانے کا کیلیفورنیا کے ڈاکٹر ایلن دی ایبٹ نے 25 اگست 1973ء کو ایک شیور لیٹ کار سے باندھ کر ایک سو چالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلائی۔ جب کہ سائیکل ریس میں سب سے زیادہ 162 سائیکلسٹ نے 1928ء کی ٹور ڈی فرانس ریس میں شرکت کی۔ جن میں سے صرف 41 اپنی منزل تک پہنچ پائے۔

ایک اندازے کے مطابق دُنیا کے ایک ارب سے زیادہ انسان سائیکل چلاتے ہیں۔ 14 اپریل 1900ء کو یونین آف سائیکلسٹ انٹرنیشنل کا قیام عمل میں آیا۔ پہلی مرتبہ سائیکل ریس 31 مئی 1868ء کو پیرس میں ہوئی، جو 1200 میٹر پر محیط تھی۔ اس ریس کے فاتح کا نام "James Moore" تھا۔ اس کی سائیکل آج بھی برطانیہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ آج کی دنیا میں سڑک، ٹریک، میدان اور پہاڑی راستوں پر بھی سائیکلنگ کے مقابلے میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی طویل ترین ریس امریکہ میں ہوئی جو ایک دن میں 206 میل (332 کلومیٹر) کے فاصلے پر محیط تھی۔

سائیکلنگ کے لیے 75 درجے کی ساخت پر بنا ہوا فریم ٹریک ریس میں زیادہ موزوں ہے مگر 73 درجے کی ساخت کا فریم ہر قسم کی تیز ریس کے لیے کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ عموماً سائیکلسٹ چمڑے کی گدی استعمال کرتے تھے۔ خصوصاً طویل سفر کے لیے اس قسم کی گدیوں کا زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ اگر چمڑے کی گدی کا استعمال کیا جائے تو اسے ہر حالت میں خشک رکھا جائے۔ گدی کو فٹ کرواتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ اس درمیانی حصہ پیڈل کی سیدھ میں ہو جبکہ سائیکلسٹ کا گھٹنا ذرا خم میں ہو۔ اسے آپ بغیر جوتوں کے زیادہ بہتر انداز میں چیک کر سکتے ہیں۔ ہینڈل کی لمبائی چوڑے رخ میں آپ کے سامنے ہو اور آپ کے کندھوں کی چوڑائی کے برابر ہونی چاہیے۔

سائیکلسٹ کے لیے جو شوز استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ بہت سی اقسام کے ہیں۔ تاہم ماہرین کا کہنا ہے کہ سائیکل ریس میں نہایت پائیدار، آرام دہ اور فٹ شوز استعمال کریں۔ موسم سرما میں بھاری اور نرم جب کہ موسم گرما میں ہلکے اور آرام دہ جوتے استعمال

خوش خبری

''باہمت بچے'' خاص نمبر منعقدہ جون 2016ء کے نتائج کا اعلان

معزز قارئین کاروان ادب اطفال کے زیر اہتمام جون 2016ء میں خاص نمبر ''باہمت بچے'' کا انعقاد ہوا تھا جس میں ملک بھر سے 16 رسائل نے حصہ لیا۔ اس مقابلے میں ماہ نامہ ''تعلیم و تربیت'' کو ''**بہترین رسالہ**'' کی کیٹیگری میں دوم انعام کا حق دار ٹھہرایا ہے۔

اس مقابلے میں تمام حصہ لینے والے قارئین بھی مبارک باد کے حق دار ہیں جن کی کوششوں اور ذوق و شوق نے ''تعلیم و تربیت'' کو دوم انعام کے حصول میں مدد دی۔

اُمید ہے تمام قارئین آئندہ بھی ایسے مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ کوشش جاری رکھیے، ہمت نہ ہاریئے کیوں کہ:

''کرے جستجو جو وہ چھوئے آسمان''

مدیرہ

کریں۔ تنگ جوتے بالکل استعمال نہ کریں۔ جوتے فروخت کرنے والے اکثر کہتے نظر آتے ہیں کہ آپ جوتے ایک دو بار پہنیں گے تو جوتے کھل جائیں گے۔ تاہم اکثر جوتے استعمال کے بعد بھی نہیں کھلتے۔ جس سے پاؤں زخمی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ سائیکلنگ کے لیے جو لباس استعمال کریں وہ صرف نائیلون کا بنا ہوا نہ ہو۔ نائیلون کی ایک خرابی یہ ہے کہ یہ پسینہ خشک نہیں ہونے دیتا۔ جس سے پسینے والی جگہ پر خارش ہونے لگتی ہے۔ کاٹن یا کاٹن مکس ایسا لباس ہے جسے آپ ہر ریس کے بعد بآسانی دھو سکتے ہیں۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ سائیکلنگ کے لیے استعمال ہونے والا لباس صابن سے دھوئیں Detergents سے نہ دھوئیں۔ آہستہ نچوڑیں اور آہستہ خشک کریں تاکہ لباس ملائم اور چمک دار رہے۔ موسم سرما کے لیے پکے اور گرم کپڑوں کا استعمال بہتر رہے گا۔ اونی گرم بنیان اور ٹریک سوٹ زیادہ مفید ہے۔

پاکستان میں سائیکل فیڈریشن کا قیام 1974ء میں عمل میں آیا۔ ٹور ڈی پاکستان (Tour de Pakistan) ریس باقاعدگی سے مکمل کی جاتی ہے۔ جو 11 مراحل پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا فاصلہ 1648 کلومیٹر (کراچی سے پشاور) بنتا ہے۔ چین وہ ملک ہے، جہاں سب سے زیادہ سائیکلنگ کی جاتی ہے۔ ☆☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْعَظِیْمُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(بڑی عظمت والا)

اَلْعَظِیْمُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے کہ عقل اس تک نہیں پہنچ سکتی اور اس کی حقیقت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں دو مرتبہ آیا ہے۔

اس عظیم رب کی عظمت میں سے یہ بھی ہے کہ مخلوق کو عظمت والے رب کے برابر نہ کریں، لہٰذا ایسے جملے بھی نہیں کہنے چاہئیں جن سے مخلوق کی بڑائی کا شبہ ہو۔ جیسے مثال کے طور پر بعض لوگ کہہ دیتے ہیں:

''اللہ کی قسم اور تمہاری زندگی کی قسم!'' اب اس جملے میں اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کے ساتھ مخلوق کو شامل بھی کر لیا گیا ہے اور نہ ہی یوں کہا جائے:

''میرا اللہ تعالیٰ کے سوا اور تمہارے سوا کوئی سہارا نہیں۔'' یا یوں کہا:

''جو اللہ تعالیٰ چاہے گا اور آپ چاہیں گے۔'' اس طرح کے جملے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خلاف ہیں۔

جوزف سے یوسف تک

مائیکل جوزف اپنے پانچ ساتھیوں سمیت خلائی شٹل میں موجود تھا۔ یہ شٹل پندرہ دن سے محوِ پرواز تھی۔ پوری ٹیم خلائی تحقیق میں سرگرداں تھی۔ وہ خلا سے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کر چکے تھے۔ اس مرتبہ مزید انوکھی اور منفرد تحقیق سامنے آئی۔

کھانا کھا کر وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا اور اپنے لیے کئی باتیں کمپیوٹر میں محفوظ کر رہا تھا۔ اسی دوران اس کی نظر درج ذیل معلومات پر اٹک گئی، اگرچہ یہ معلومات اسے مطلوب نہیں تھی۔

''ایک بچہ ہو یا ایک چھ فٹ لمبا انسان، اس کا جسم دس لاکھ کھرب خلیوں سے بنا ہوتا ہے۔ خلیے اینٹوں کی شکل پر مشتمل ہوتے ہیں جو صرف خوردبین سے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔'' یہ عجیب معلومات پڑھ کر اس نے پانچ کو دس لاکھ کھرب سے ضرب دیا تو کمپیوٹر اس کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

کمپیوٹر، جوزف کے پانچ ساتھیوں میں موجود خلیوں کو نہ بتلا سکا، تو وہ مسکرا اُٹھا۔ اس کی نظر سے پھر ایک جملہ گزرا۔

''انسانی جسم میں جتنا فاس فورس ہوتا ہے، اس سے دیا سلائی کی دو ہزار تیلیاں بن سکتی ہیں۔'' وہ پھر متعجب ہوا۔

''گردہ ہر روز تقریباً پچاس گیلن خون فلٹر کرتا ہے۔''

پھر اس کی نظر خلائی تحقیق کی معلومات پر پڑی۔ نئے نئے انکشافات نے اس کی طبیعت میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔

کمپیوٹر کی اسکرین اب یہ بتا رہی تھی:

''زمین اپنے محور کے گرد 1670 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے گردش کرتی ہے اور سب سے تیز گولی کی رفتار 1800 کلومیٹر فی گھنٹا ہے۔''

''اوہ! یہ زمین کس قدر تیزی سے گردش کر رہی ہے۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا:

''جوزف! اس کائنات میں کروڑوں ستارے اور کہکشائیں ہیں۔ یہ کیسے بنیں؟'' اسے اس کے سائنٹسٹ دوست یوسف کا سوال یاد آیا۔

اس وقت وہ ایک بہت بڑے سیارے کے گرد تھے جو زمین سے بہت بڑا تھا۔

''کیا یہ خود بن گئے؟'' اس کے سامنے اب یوسف کا دوسرا سوال تھا۔

''جب یہ کائنات اتنی عظیم ہے تو اس کائنات کو بنانے والا کتنی عظمت والا ہوگا۔''

یہ یوسف کا تیسرا سوال تھا۔

''جوزف! یہ شٹل ہم جیسے انسانوں نے بنائی ہے تو اس عظیم کائنات کو بھی عظمت والے رب نے بنایا ہے، اس سے تم انکار نہیں کر سکو گے۔''

یہ یوسف کا چوتھا جملہ تھا۔

جوزف جیسے جیسے اپنے خلائی سفر سے گزرتا رہا، خلائی تحقیق سے متعلق انوکھی اور حیران کن معلومات سامنے آتی چلی گئیں۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔

جوزف اپنا مشن مکمل کر کے اپنے دوست یوسف کے پاس جا پہنچا۔

''جوزف! سفر کیسا رہا؟'' یوسف نے پوچھا۔

''جوزف نہیں یوسف۔'' جوزف نے کہا۔

''یوسف! اب میں بھی اس عظمت والے رب پر ایمان لا کر یوسف بن چکا ہوں۔'' جوزف کے منہ سے یہ بات سنتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور بے ساختہ پکارا:

''وہ رب واقعی بڑی عظمت والا ہے۔''

رکوع کی تسبیح

حضور ﷺ رکوع میں یہ تسبیح پڑھتے تھے:

''سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیم.''

''پاک ہے میرا رب جو بڑی عظمت والا ہے۔''

سات مرتبہ

اگر آپ کسی کو غم زدہ دیکھیں تو آپ اس کا غم دُور کروانے میں اس غم زدہ کا تعاون کر سکتے، مگر وہ کیسے؟

وہ اس طرح سے کہ ایک دعا اسے بتا دیں کہ جو کوئی صبح و شام سات مرتبہ اس دعا کو مانگے گا تو اللہ تعالیٰ دُنیا و آخرت کے تمام غموں سے اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ دعا یہ ہے:

''حَسْبِیَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم.''

''میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔''

یاد رکھنے کی باتیں

1- اس مبارک نام سے ہم نے یہ سیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بڑائی دل میں نہ ہو۔

2- دُنیا کی کسی بھی بڑی سے بڑی چیز کو دیکھ کر متاثر نہ ہوں، بل کہ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اس چیز کی چھوٹائی کی کوئی حد نہیں ہے۔

3- جب وہ بڑی عظمت والا ہے تو اس کا ہر حکم بھی بہت عظمت والا ہے، لہٰذا اس کے تمام احکام کو مانتے ہوئے اپنی زندگی گزاریں۔

☆☆☆

صالحہ محبوب

فن سے ہے عزت!

"فلکا! او فلکا! یار کیا بات ہے؟ آج منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟ کیا کسی گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے یا تیری طبیعت خراب ہے؟ اتنی جلدی گھر آ گیا اور لیٹ بھی گیا۔ خیر تو ہے؟" دینو نے اپنے بڑے بھائی کو خلاف معمول گھر میں چارپائی پر لیٹے دیکھا تو فکرمندی سے بولا۔

"بس بھائی! طبیعت نہیں، قسمت خراب ہے۔ بس ہمارے نصیب میں بے عزتی ہی بے عزتی لکھی ہے۔ جسے دیکھو فلکا نائی، او فلکو نائی کی آواز لگاتا ہے۔ پہلے تو اُمید تھی کہ یہ بال سفید ہو جائیں گے تو کوئی ہمیں انسان سمجھنے لگے گا۔ اولاد جوان ہو گئی۔ ہم بڑھے ہو گئے مگر رہے وہی فلکا نائی اور دینو نائی۔ یار یہ ابے نے ہمارے نام بھی کیسے رکھے ہیں، فلکا نائی ولد شبراتی نائی۔ یار پیچھے تو پڑا رہنا چاہیے، بھلا اسے ذات بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے، بیٹوں کی ہیئر ڈریسر کی شان دار دکانیں ہیں۔ کام ہی کام مگر حسرت ہی رہی کہ کوئی ہمیں بھی صاحب کہے، مسٹر کہے اور کچھ نہیں تو عزت سے بات ہی کر لیا کرے۔" فلکا واقعی خاصا پریشان اور غصے میں تھا۔

"بھائی! یہ نام تو ہمارے ساتھ پچاس سالوں سے ہیں۔ یاد ہے جب اسکول میں لڑکے ہم دونوں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ تو ہم نے انہیں بدلنے کی کتنی کوششیں کی تھیں۔ تو نے محمد علی نام رکھا تھا اور میں نے ندیم، مگر سوائے تیرے اور میرے یا ہماری اماں کے کبھی وہ نام کسی نے نہیں پکارے۔ صرف ہمارا مذاق ہی اُڑایا گیا۔ یار ہمارے محلے پڑوس میں کوئی ہمیں عزت دینے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے کا دل دکھانے میں سب کو مزہ آتا ہے مگر یہ تو ہمیشہ کی بات ہے۔ تو بتا آج منہ کیوں بنایا ہوا ہے۔" دینو بھائی کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ بھائی کی دل جوئی کے لیے موڑھا گھسیٹ کر چارپائی کے بالکل قریب لے آیا۔

"بس یار! آج میں نادرا کے دفتر گیا تھا جہاں شناختی کارڈ بنتے ہیں۔ پہلے تو دوبارہ کارڈ بنوانے کی فیس دی۔ پھر رسید لے کر انتظار کرنے والے کمرے میں بیٹھ گیا۔ ٹھنڈا کمرہ، صاف ستھرا ماحول۔ آج تیری بھرجائی نے میرا سفید جوڑا بڑا دل لگا کر استری کیا تھا۔ اور پتر نے جوتی بھی اچھی طرح چمکائی تھی۔ میں وہاں بیٹھا خود کو معزز شہری سمجھ رہا تھا۔ میرا نام بلایا گیا فلکا نائی ولد شبراتی نائی۔ میرے آس پاس بیٹھے لوگ ہنسنے لگے۔ ہمارے ہاں لوگ اپنے کام

سے کام کیوں نہیں رکھتے۔ اگر میں اچھا کام کروں تو تعریف کبھی نہیں کریں گے اور میری غلطی کی پکڑ کرنے سب آ جاتے ہیں۔ خیر میں اندر گیا۔ تصویر کھنچوائی، نام کی تصدیق کرائی، انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔ اماں کا نام پوچھا، میں نے ''لڈو بی بی'' بتایا تو پھر سے دانت نکالنے لگا۔ اماں پچھلے دنوں نیا شناختی کارڈ بنوا کر آئی ہے۔ لڈو بی بی زوجہ شبراتی نائی اور ساتھ اپنی عمر لکھوا آئی ہے چالیس سال۔ اب میری عمر لکھی ہے پچاس سال اور اماں چالیس سال۔ بس سب اتنا ہنسے۔ اب یہ غلطی ٹھیک کرانے کی فیس الگ اور بے عزتی پروگرام الگ۔'' فلکا واقعی بہت پریشان تھا۔

''ہیں...... یہ اماں کو کیا ہوا؟ چالیس سال کی تو اپنی چھوٹی بہن ہو گی۔ بس اماں کا حساب کتاب بھی ناں...... لیکن یہ اماں کی عمر تمہارے کارڈ میں کیسے آ گئی؟'' دینو اب واقعی حیران بلکہ پریشان ہوا۔

''پتا نہیں، کمپیوٹر میں اماں کا نام بھی آ رہا تھا۔ ابے کا بھی اور تو اور سارے بچوں کا بھی۔ تیری بھرجائی کا بھی۔ اسے سب کچھ پتا تھا۔ نام بھی عمر بھی۔'' فلکا اَن پڑھ محلے داروں کی ہنسی مذاق کا تو عادی تھا مگر آج صاف کپڑوں اور چمکتے جوتوں کے باوجود پڑھے لکھے لوگوں کے مذاق کا نشانہ بننے پر رنجیدہ ہوا۔

''اچھا! اب تو دل پر نہ لے۔ آج کل تھانے دار بار بار شہر کا چکر لگاتا ہے۔'' دینو، بھائی کو تسلی دیتا ہوا پوچھنے لگا۔

''پندرہ دن میں مل جائے گا لیکن حکومت کو چاہیے کہ جیسے ان دفتروں میں ہمارے بیٹھنے کا انتظام اچھا کیا ہے، عزت بھی دیا کریں۔ بھلا سب کے سامنے اس طرح مذاق اُڑانا کوئی شرافت ہے؟'' فلکا بولا۔

''دُکان پر کون ہے؟ تُو تو گھر بیٹھا ہے۔'' دینو موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''دونوں بیٹے دُکان میں ہی ہیں۔ اب تو بڑے کاریگر ہو گئے ہیں، نائی نہیں بلکہ ہیئر ڈریسر۔ دکان کی تو شکل ہی بدل دی ہے۔ نئے بلب، کرسیاں، شیشے، ٹی وی، اے سی اور نئی مہنگی کریمیں لانے سے دُکان داری میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ ہم بھی دولہے تو تیار کیا کرتے تھے۔ بال کاٹے، شیو بنائی پھر اس کے گھر جا کر لڑکے کو کھارے پر بٹھایا، نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے۔ نیگ یا شگن لے لیا۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ دولہا کے منہ کو تھپڑ (مساج) مار مار کے لال کر دیتے ہیں۔ کریمیں لگانے سے منہ چمک جاتا ہے اور ہزاروں روپے لے لیتے ہیں۔ واہ جی واہ! ہم نائیوں سے لوگ خود آ کر تھپڑ بھی کھاتے ہیں، خوش بھی ہوتے ہیں اور پیسے بھی دل کھول کر دے جاتے ہیں۔'' فلکا بیٹوں کی کارگزاری سے بے حد خوش تھا۔

''ہاں یار، دونوں بھائی بڑے کاریگر بن گئے ہیں۔ آخر تو نے دونوں کے نام بھی تو بڑی عزت والے رکھے ہیں۔ ہمارے پیشے کی عزت لوگ کریں یا نہ کریں، عزت دار ناموں کی تو کریں گے ناں۔ قسمت بھی اچھی اور عزت بھی۔ اب تو دونوں مجھے کہہ رہے تھے کہ چاچا ہم نائی نہیں ہیئر ڈریسر ہیں۔ میک اپ ایکسپرٹ ہیں۔ کل ایک گاہک کے عجیب چوہوں سے بال کاٹے تھے اور پھر انہیں سیدھا کھڑا کر کے کانوں اور گردن سے بالکل صفا ٹنڈ کر دی۔ میں تو گھبرا گیا اب تو اس کی پٹائی ہوئی کہ ہوئی مگر اس گاہک نے منہ ٹیڑھا کر کے باقاعدہ شکریہ ادا کیا اور بڑا نوٹ اسے پکڑایا۔ یار یہ کیسا فیشن آ گیا ہے؟ میری تو سمجھ سے باہر ہے۔

اب دونوں مجھے کہتے ہیں کہ ابا آپ گھر ہی رہا کرو۔ دُکان ہم پر چھوڑ دو، مگر میں نے ساری عمر یا تو حجامتیں بنائی ہیں یا دیگیں پکائی ہیں۔ اب گھر بیٹھ کر کیا کروں۔ دل نہیں لگتا۔'' فلکا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''بس یار وقت وقت کی بات ہے۔ تھوڑے دن پہلے یہ سارے چھوٹے چھوٹے تھے۔ کام سیکھ رہے تھے۔ اب ہم پر رعب بھی جماتے ہیں اور ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کرتے ہیں۔ میرے دونوں زلزلہ اور طوفان بھی ایسے ہی نخرے کرنے لگے ہیں۔ کل پرسوں مال لینے شہر گئے تو میں دُکان پر بیٹھ گیا۔ کسی امیر باجی کی نوکرانی دو بچوں کو لے کر آئی۔ [illegible] کٹنگ [illegible] کے لیے بھیجا ہے۔ ایک بچہ تین سال کا اور [illegible] سال [illegible]۔ نوکرانی بچوں کو میرے پاس چھوڑ کر سودا لینے گئی۔ میں نے بچوں کی ٹنڈ کر دی۔ ہمارے دور میں تو گرمیوں میں بچوں کی ٹنڈ ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ عورت واپس آئی اور بچوں کو دیکھ کر غصہ کرنے لگی۔ مجھے پیسے بھی نہ دیئے، بے عزتی بھی خوب کی۔'' دینو بھائی بھی اپنے دکھ کھول کر بیٹھ گیا۔ جانے معاشرے میں نائی کے مقام کا بہت ہی کم ہونے کا دکھ تھا یا اپنی بے وقعتی کا غم۔ دونوں بھائی چپ ہو گئے۔

فلکے کی بیوی چائے لے آئی اور ساتھ میں بسکٹ بھی۔ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے سے غموں کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ یہ ان دونوں کی مشترکہ رائے تھی۔

چھوٹے بھائی سے باتیں کر کے فلکے کا دل بھی ہلکا ہو گیا کیوں کہ دونوں کے بیشتر مسائل ہمیشہ سے ایک جیسے تھے۔ شبراتی نائی کا خاندان نسلوں سے اسی جگہ آباد تھا۔ پہلے یہ جگہ ایک گاؤں تھی جو آہستہ آہستہ ترقی کرتے پہلے قصبہ بنا اور اب تو باقاعدہ شہر کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ شبراتی سارے گاؤں کے لوگوں کی حجامتیں بناتا۔ بچوں کی ٹنڈیں کرتا اور شادیوں پر مہمانوں کو بلاوا دینے کے علاوہ شادی کی تمام رسومات میں شریک ہوتا۔ شادی یا غمی ہر موقع پر دیگیں پکانے کا کام بھی اسی کے ذمے ہوتا۔ وہ گاؤں کی آبادی کا ایک بے حد کارآمد فرد تھا مگر رہتا ہر حال میں کمی کمین ہی۔ جانے ہندو معاشرے کے ذات پات کے نظام کی جڑیں اس گاؤں میں گہری تھیں یا لوگوں نے اثر قبول کر رکھا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود نائی سے فاصلہ بھی رکھا جاتا۔ اس کے ساتھ رشتہ کرنا بھی کسی کو پسند نہ تھا۔ شبراتی کے دو بیٹے فلکا اور دینو تھے۔ جانے کس طرح سادے نام رکھے گئے تھے یا لوگوں نے پکار پکار کر رکھ لیے تھے مگر ساتھ نائی کا لاحقہ ضرور لگا ہوا تھا۔ فلکے اور دینو دونوں نے اسکول جا کر پڑھنے کی پوری کوششیں کی مگر دونوں ہی کا دماغ پڑھائی سے زیادہ گاؤں کی معاشرتی اور سماجی سرگرمیوں میں زیادہ چلتا تھا۔ سو پانچویں اور چھٹی جماعت میں دو دو سال لگانے کے بعد دونوں باپ کے ساتھ کام سیکھنے لگ گئے۔ گاؤں قصبے کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کام کے مواقع بھی بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی شبراتی نے دونوں کو الگ الگ دُکانیں کھول دیں۔ دُکانیں الگ ہوئیں تو گھر بھی جدا ہو گئے۔ اب فلکے کے دونوں بیٹے اور تینوں بیٹیاں شہر کے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ فلکے کے نزدیک نام انسان کی عزت کی پہلی نشانی ہے۔ سو اس نے اپنے بیٹوں کے نام بڑے سیاست دانوں کے ناموں پر رکھے۔

دینو کے نام رکھنے کے اپنے ہی اصول تھے۔ وہ عظیم حادثات کے ساتھ اپنے بچوں کو منسوب کرنے کا قائل تھا۔ بیٹوں کے نام زلزلہ اور طوفان رکھا، بیٹی کا نام دادا کے نام کی مناسبت سے شبراتن رکھا گیا۔ دونوں بھائی اب ادھیڑ عمری سے بھی آگے جا چکے تھے۔

شبراتی کو فوت ہوئے بھی عرصہ بیت چکا تھا۔ اماں دونوں بیٹوں کے ساتھ باری باری رہتی تھی۔ بیٹوں نے دسویں کے بعد پڑھائی سے انکار کیا تو دونوں دینو اور فلکے نے انہیں اپنا ہنر سکھا دیا تھا۔ لڑکوں نے دور جدید کے حساب سے دُکانوں کی آرائش کی تو اپنا حلیہ بھی انتہائی ماڈرن کر لیا لیکن معاشرہ ہنوز ان ہنرمندوں کو باعزت مقام دینے کو تیار نہ تھا۔

فلکے کی بیٹیاں پڑھائی میں خوب ہوشیار تھیں۔ میٹرک کے بعد کالج اور پھر یونیورسٹی کے بعد نوکریاں حاصل کرنے میں بھی کام یاب ہو گئیں۔ دونوں کو سرکاری اسکولوں میں اُستانیوں کی نوکری کیا ملی، رشتے بھی اچھے گھرانوں میں ہو گئے۔ فلکا اس سب کو اپنے رکھے باعزت ناموں کا کمال سمجھتا رہا تو اس کی بیوی لڑکیوں کے نصیب کی اچھائی۔ محنت اور تعلیم کے کرشمے کو سمجھنے سے دونوں ہی قاصر تھے۔

شبراتن اور نور جہاں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا راستہ بہنوں نے ہموار کر دیا تھا۔ سو میٹرک کے بعد ایف ایس سی میں شدید محنت رنگ لائی اور دونوں میڈیکل کالج کا میرٹ بنانے میں کام یاب ہو گئیں۔ ان کے پورے خاندان کی پہلی لڑکیاں جو ڈاکٹر بن رہی تھیں۔ فلکے اور دینو کو لوگوں کے رویوں میں فرق محسوس ہونے لگا تھا۔

آج کا دن بڑا چمک دار تھا۔ دونوں بھائی سفید کلف لگے نئے کپڑے پہنے میڈیکل کالج کے آڈیٹوریم میں پہنچے تھے۔ شہر کے معزز لوگ، پڑھے لکھے ڈاکٹر، ان کے انداز و اطوار دونوں بھائیوں کے احساس کمتری کو بڑھا رہے تھے۔ بے نظیر اور شبراتن کے والدین ہونے کے ناطے انہیں اگلی نشستیں دی گئیں۔ گورنر صاحب نے ڈاکٹر بے نظیر اور ڈاکٹر شبراتن کو تالیوں کی گونج میں گولڈ میڈل سے نوازا۔ دونوں کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت اور کارکردگی پر شہر کے معززین حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ تالیاں بج رہی تھیں، تعریفیں ہو رہی تھیں۔ دُور دُور تک ان کے خاندانی پیشے کا کوئی سابقہ اور لاحقہ نہیں تھا۔

برسوں بعد اس احساسِ کمتری نے شکست کھا لی تھی۔ آج دونوں بھائی سمجھ چکے تھے کہ اس ہندوانہ ذہنیت اور تعصب کو شکست دینے کا بہترین طریقہ محنت، محنت اور محنت ہے۔ لوگ کام یاب آدمی کا ماضی بھول کر اس کے حال پر رشک کرنے لگتے ہیں اور مستقبل سے اُمیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ ناموں سے نہیں، کوششوں اور محنت سے عزت کا حصول ممکن ہے۔ ☆☆☆

ننھے قارئین

بوجھو تو جانیں

1- ایک کپڑا ایسا کہلوایا
وقت پڑے پر جب منگوایا
آپ نہ پہنے جو بھی لائے
جو پہنے خود دیکھ نہ پائے
(ساجد عدیل، فیصل آباد)

2- جانور ایک ایسا بھی دیکھا پھٹ پھٹ کرتا جائے
کوئی اس کی پیٹھ پر بیٹھے تب وہ چال دکھائے
(بینش آفاق، کراچی)

3- اس رانی کے کیا ہی کہنے
اس کے تن پر موتی گہنے
لائے جب اس کو بازار
موتی سب نے لیے اُتار

4- کبڑی ماں نے بچے پالے
دھکے دے کر گھر سے نکالے
(اشفاق احمد، لاہور)

5- سب سے تیز اس کی رفتار
ذہن میں آئے سو سو بار
(بلال چوہدری، راول پنڈی)

6- دُنیا میں ہے ایک خزانہ
اس کا مالک بڑا سیانا
اس کو ہاتھوں ہاتھ لٹائے
پر دولت بڑھتی ہی جائے
(عبداللہ رفیق، لاہور)

7- چار ہیں رانیاں اور اِک راجا
ہر اِک کام میں ان کا ساجا
(کشف راجا، جہلم)

پہلے 1 سے 40 تک نقطے ملایئے۔ ایک دل چسپ تصویر بن جائے گی۔ پھر چاروں تصویروں کی مدد سے معما حل کیجیے۔
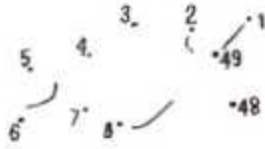
میری زندگی کے مقاصد

عثمان آصف، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

زہرہ سلطان، جہلم
میں فائٹر پائلٹ بن کر مریم مختار کی طرح اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

سید امجد حسین ہمدانی، لاہور
میں بڑا ہو کر پولیس انسپکٹر بنوں گا۔

ماہین کلثوم، اسلام آباد
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے وطن کا نام روشن کروں گی۔

محمد شاہ زیب، کراچی
میں بڑا ہو کر فٹ بال کا چیمپئن بنوں گا۔

منیحہ اعجاز، لاہور
میں بڑی ہو کر جانوروں کی ڈاکٹر بنوں گی۔

شاہ زیب علی، سرگودھا
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد امجد، کراچی
میں بڑا ہو کر باعمل عالم دین بننا چاہتا ہوں۔

نورالعین، گوجر خان
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور ملک کی خدمت کروں گی۔

ندا زینب، لاہور
میں بڑی ہو کر دل کی ڈاکٹر بنوں گی۔

محمد سمیع، کراچی
میں کام یاب انسان بنوں گا۔

محمد حماد رؤف، لاہور
میں مائیکرو سافٹ انجینئر بن کر اپنے ملک اور والدین کی خدمت کروں گا۔

محمد معیز احمد، فیصل آباد
میں بڑا ہو کر ایک ہونہار فوجی بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

صہیب نوید بیگ، فیصل آباد
میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بنوں گا اور اپنے وطن کی حفاظت کروں گا۔

حماد عاطف، لاہور
میں بڑا ہو کر آرمی میں شامل ہوں گا اور اپنی جان ملک پر قربان کروں گا۔

فاطمہ آصف، اسلام آباد
میں آرمی میں ڈاکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

فرید احمد، لاہور
میں آرمی میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں تاکہ زخمیوں کی مدد کرسکوں۔

حسان احمد، واہ کینٹ
میں بڑا ہو کر آرمی میں جانا چاہتا ہوں۔

عبدالرافع، کراچی
میں بڑا ہو کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

گام گام احتیاط

امام ابو حنیفہؒ نے تجارت میں اپنے ایک شریک کے پاس کپڑا بھیجا اور بتایا کہ کپڑے میں یہ عیب ہے، خریدار کو عیب سے آگاہ کر دینا۔ اس نے وہ کپڑا فروخت کیا مگر خریدار کو عیب بتانا بھول گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کو جب معلوم ہوا تو اس سے حاصل ہونے والی ساری قیمت صدقہ کر دی جس کی رقم تیس ہزار درہم تھی۔

(حافظ عفیفہ اشرف)

ملک ملک کی کہاوتیں

تجربہ وہ کنگھی ہے، جو ہمیں اس وقت ملتی ہے جب ہمارے بال جھڑ چکے ہوتے ہیں۔ (بلجیئم کی کہاوت)

شریف وہ ہے جس کی گواہی کے لیے کوئی نہ آئے۔ (روسی کہاوت)

زندگی کا نچوڑ تجربہ ہے اور تجربے کی روح عقل ہے۔ (چینی کہاوت)

دولت جمع مت کرو کیوں کہ کفن میں جیب نہیں ہوتی۔ (چینی کہاوت)

بارش ٹوٹی ہوئی جھونپڑی پر زیادہ زور سے برستی ہے۔ (بنگلہ دیشی کہاوت)

اصل دوست

☆ دوست وہی ہے جو مصیبت میں کام آئے۔
☆ مطلبی دوست ایک کوئلے کی طرح ہے۔
☆ دوست ایک ہیرا ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو کبھی جڑ نہیں پاتا۔
☆ پُرانا دوست سب سے بہتر آئینہ ہے۔ (محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

پھول

دربار لگا ہوا تھا کہ اچانک تخت پر بیٹھے ہوئے اکبر بادشاہ کے ذہن میں ایک سوال آیا، اس نے درباریوں سے کہا۔ ”میرے سوال کا جواب دو کہ پھولوں میں سب سے بہتر پھول کون سا ہے؟“

ایک درباری نے ادب سے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ”جہاں پناہ! سب سے اچھا پھول گلاب کا ہے۔“ دوسرا درباری اُٹھا اور کہنے لگا۔ ”بادشاہ سلامت! رات کی رانی کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور نیند بھی اچھی آتی ہے۔ اس لیے رات کی رانی سب سے بہتر ہے۔“ ہر درباری مختلف پھولوں کی تعریف کر رہا تھا۔

درباری بیربل کی باری آئی تو اکبر بادشاہ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کس پھول کی تعریف کرے گا۔ درباری تمام پھولوں کی تعریف کر چکے تھے۔ بیربل بھی بادشاہ کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا۔ اس لیے اسے ایسا جواب دینا تھا کہ تمام درباری سمیت بادشاہ لاجواب ہو جاتا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کہا۔ ”ظلِ سبحانی! پھولوں میں سب سے بہتر پھول وہ ہے جس سے تمام بندگانِ خدا کے لیے لباس تیار ہوتا ہے۔ وہ ہے کپاس کا پھول۔“ (مقدس چوہدری، راول پنڈی)

انسان کی تقسیم

موت کے بعد انسان پانچ حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

☆ مال وارث لے جائیں گے۔
☆ روح ملک الملک لے جائیں گے۔
☆ گوشت کیڑے مکوڑے کھا جائیں گے۔
☆ ہڈیاں مٹی کھا جائے گی۔
☆ نیکیاں قرض خواہ لے جائیں گے۔

لیکن یہ کوشش نہ کرنا کہ کہیں ”ایمان“ شیطان نہ لے جائے۔

(سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ)

بس اب پرسوں ......

بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!
نہ کوئی بعد ازاں فاقے کرے گا
چین سے کھا کر مرے گا جو مرے گا
جو گھنٹا بھر کو مزدوری کرے گا
زر و گوہر سے اس کا گھر بھرے گا
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!
دلدر دُور ہو جائیں گے پیارے!
ترقی پاؤں چومے گی تمہارے!
ہر اک ووٹر کے ہوں گے وارے نیارے
جو بل ہیں، نوٹ بن جائیں گے سارے

بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے !
بھلا اب میں کوئی جھوٹا ہوں یارو !
لب بام آ کے یوں ہمت نہ ہارو
گزارے ہیں جہاں چالیس اک سال
یہ اڑتالیس گھنٹے اور گزارو
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے !

سنہری باتیں

☆ جو ہوش میں ہے وہ کبھی تکبر نہیں کرتا۔
☆ عقل منداس وقت تک نہیں بولتا جب تک خاموشی نہیں ہو جاتی۔
☆ بہت سے کام صبر سے ہوتے ہیں اور جلد باز انسان منہ کے بل گرتے ہیں۔
☆ بخیل آدمی کی دولت اس وقت زمین سے باہر آتی ہے جب وہ خود زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔
☆ اگر انسان خوشی اور غم کی فکر سے بلند ہو جائے تو آسمان کی بلندی بھی اس کے قدموں کے نیچے آجائے۔
☆ بوجھ اُٹھانے والے گدھے اور بیل، لوگوں کو ستانے والے انسانوں سے بہتر ہیں۔
☆ جس نے علم حاصل کیا اور عمل نہ کیا، وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے ہل چلایا اور بیج نہ بکھیرا۔
☆ ہر انسان اپنی عقل کو بڑا سمجھتا ہے اور اپنے بچے کو خوب صورت۔

(بشریٰ حسینی، کلورکوٹ)

سکندر اعظم کا جواب

کسی نے سکندر اعظم نے پوچھا کہ آپ نے دُنیا کے اتنے ملک کس طرح فتح کر لیے؟ آپ سے پہلے جو بادشاہ گزرے ہیں ان کے پاس بھی خزانوں اور لشکروں کی کمی نہ تھی لیکن ایسی شان دار فتوحات ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئیں۔

یہ سوال سن کر سکندر نے جواب دیا۔ ''خدا کی مہربانی سے۔ اس کے بعد یہ کام یابی مجھے اس وجہ سے بھی حاصل ہوئی کہ میں نے جن ملکوں کو فتح کیا ان کے عزت والے لوگوں کی عزت کی اور وہاں کے اچھے لوگ جو کارنامے انجام دے گئے تھے انہیں باقی رکھا اور ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رعایا کو

نہیں ستایا۔''

(عبدالمقیت، فیصل آباد)

لفظ لفظ موتی

☆ اُستاد کی عزت کرو یہ وہ ہستی ہے جو تمھیں اندھیرے سے نکال کر روشنی کی راہ دکھاتی ہے۔
☆ ایسا اُستاد جو شاگرد میں شوق پیدا کیے بغیر اسے پڑھاتا ہے وہ گویا لوہے پر ہتھوڑے برساتا ہے۔
☆ اچھی سوچ کے ساتھ راستہ تلاش کرو گے تو راہیں روشن ہو جائیں گی۔
☆ علم والوں سے سیکھ اور کم علم والوں کو سکھا۔
☆ سورج کی طرح اپنی شخصیت روشن بناؤ۔
☆ بُرائی اندھیرا ہے اور خیر چراغ ہے۔
☆ بڑے کام کرو مگر دعوے نہ کرو۔
☆ سوچیں گہری ہو جائیں تو فیصلے کمزور ہو جاتے ہیں۔
☆ دعا ایسا جادو ہے جو ارادے کو پرواز سکھاتا ہے، اسے جاری نہ رکھنے والے لوگ دعا کے اس زبردست بھید کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔
☆ جہالت بدترین دوست ہے، سب سے وفادار ہمارا علم ہے۔

(چوہدری عبدالباسط رضا، لاہور)

اقوال زریں

☆ مومن کو اتنا علم ہی کافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔
☆ جس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اللہ تعالیٰ اسے زیادہ عطا کرے گا۔
☆ کام یابی کی تین منزلیں ہیں۔ علم، عمل اور سوچ و بچار۔
☆ جب کسی شخص کو دوسروں کے عیب جوئی کرتے ہوئے پاؤ تو اسے اپنے دوستی کے زمرے سے نکال لو۔
☆ سچا دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت کام آئے۔

(محمد وقاص خان، پشاور)

بندہ اور اس کا رب

حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں، میں نے ایک خدا رسیدہ بزرگ سے سنا۔ وہ فرما رہے تھے کہ انسان جتنا سرگرم روزی حاصل کرنے کے لیے مشغول رہتا ہے، اگر اتنی ہی توجہ سے روزی رساں کو یاد کرے تو اس کا رتبہ فرشتوں سے زیادہ بلند ہو جائے۔ رزق کے لیے اسے کبھی تردد ہی نہ کرنا پڑے۔

(مہک علی، پشاور)

ضرب المثل کہانی

زبیدہ سلطانہ

4, 8, 16, 22, 38, 52, 100

آم کھانے سے غرض نا کہ پیڑ گننے سے

جاوید صاحب کے کسی دوست نے انہیں اپنے باغ کے آموں کا خاصا بڑا ٹوکرا تحفے کے طور پر بھیجا۔ آم تو سب ہی رغبت سے کھاتے ہیں۔ اتنے ڈھیروں آم دیکھ کر بچوں کی تو عید ہو گئی۔ جاوید صاحب کا بیٹا پوچھنے لگا:

''ابو! یہ اتنے سارے آم کس نے بھیجے ہیں؟''

''گاؤں میں ہمارے دوست ہیں اشرف خان، ان کے وہاں آموں کے باغ ہیں۔ بس بیٹا! اس مرتبہ انہوں نے فصل اُترنے پر ہمیں بھی یاد رکھا۔''

''میرا خیال ہے سینکڑوں درخت ہوں گے کیوں کہ انہوں نے اتنے ڈھیروں آم صرف آپ کو تحفے میں بھیجے تو باقی دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی بھیجے ہوں گے؟'' بیٹے نے کہا۔

''ہاں، ضرور بھیجے ہوں گے۔'' جاوید صاحب نے جواب دیا۔

''ابو! اگر ہم ان چھٹیوں میں گاؤں گئے تو میں جا کر اشرف صاحب کے باغ میں آموں کے پیڑ ضرور گنوں گا۔ سینکڑوں کیا میں تو سوچتا ہوں ہزاروں پیڑ ہوں گے ان کے باغ میں۔'' چھوٹا بیٹا بولا تو سب قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

''ارے بھائی! تم آم کھاؤ، تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے پیڑ گننے کی؟'' ابو نے ہنستے ہوئے کہا۔

شام کو پڑوسیوں میں سے کسی کے ہاں سے پلاؤ آیا۔ رات کے کھانے پر جاوید صاحب نے میز پر پلاؤ دیکھا تو بہت خوش ہوئے کیوں کہ پلاؤ وہ ہمیشہ شوق سے کھاتے تھے، مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں ڈالا تو بولے:

''بیگم! یہ آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا تو نہیں، کہاں سے آیا ہے؟''

''آپ بھی بیٹے کی طرح پیڑ گننے چل پڑے۔ بس آم کھانے سے غرض رکھیں، پیڑ نہ گنیں؟'' بیوی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دار چینی

کھانوں کی تیاری میں جو مصالحے استعمال ہوتے ہیں، ان میں "دارچینی" بھی شامل ہے۔ دارچینی درحقیقت ایک درخت کی چھال

ہے۔ اسے انگریزی میں "CINNAMON" عربی میں "قرفۃ" اور فارسی میں "دارچینی" کہتے ہیں۔ اس درخت کا سائنسی نام "Cinnamomum Verum" ہے جب کہ اس کے خاندان کا نام "Lauraceae" ہے۔ یہ سدا بہار درخت ہے جس کا بنیادی طور پر تعلق سری لنکا سے ہے۔ دُنیا کا 80 سے 90 فی صد دارچینی سری لنکا پیدا کرتا ہے۔ درخت کی لمبائی 10 سے 15 میٹر (32 سے 50 فٹ) ہوتی ہے۔ اس کے پتے 7 سے 18 سینٹی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ پھولوں کا رنگ سبز ہوتا ہے جو مخصوص بُو پیدا کرتے ہیں۔ اس کا پھل ایک سینٹی میٹر لمبا جامنی رنگ میں ہوتا ہے۔ دارچینی کے خشک چھلکے کھانوں میں مخصوص خوشبو پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ ایک آئل جو گولڈن پیلے رنگ میں ہوتا ہے، دارچینی کا چاکلیٹ کی تیاری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دارچینی کو ڈونٹ، کیک، بسکٹ، گولیوں، ٹافیوں، کوفی، چائے کے علاوہ سوپ، سالن وغیرہ میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ دارچینی میں چکنائی، نشاستہ، پروٹین، سوڈیم، پوٹاشیم، وٹامن اے، وٹامن سی، کیلشیم، آئرن، وٹامن ڈی، وٹامن B_{12} اور میگنیشیم بھی موجود ہے جو دارچینی کی غذائی اہمیت کو دوچند کردیتے ہیں۔

انسانی گردے

خون میں سے نائٹروجنی مادے صاف کرنے کے لیے لوبیے کی شکل کے دو گردے (Kidneys) ریڑھ کی ہڈی کے قریب موجود ہیں۔ دایاں گردہ جگر کی وجہ سے تھوڑا سا نیچے ہے۔ جب کہ بایاں گردہ ریڑھ کی ہڈی کی سطح پر ہے۔ مردوں میں اس کا وزن 125 تا 170 گرام اور خواتین میں 115 سے 155 گرام ہوتا ہے۔ گردے کی لمبائی 11.2 سینٹی میٹر (4.4 انچ) ہوتی ہے۔ ان کی

موٹائی 3 سینٹی میٹر اور چوڑائی 6 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ رینل آرٹری (Renal Artery) خون لے کر گردے تک جاتی ہے۔ گردے میں لاکھوں خوردبینی نالیاں ہوتی ہیں جنہیں نیفرون (Nephrones) کہا جاتا ہے۔ یہ گردے کے ساخت اور فعل کی اکائی ہیں۔ یہ نالیاں خون میں سے بیکار مادے جدا کرکے پیشاب بناتی ہیں۔ انسانوں میں یوریا سب سے اہم نائٹروجنی بیکار مادہ ہے

جسے یوریٹر (Ureter) نامی نالی کی مدد سے مثانے میں لایا جاتا ہے اور بوقت ضرورت یوریتھرا (Urethra) ایک نالی کی مدد سے جسم سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کیلشیم کے زیادہ ہونے کی وجہ سے گردے میں پتھری پیدا ہو جاتے ہیں۔ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر بھی گردوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دُنیا بھر میں مارچ کی دوسری جمعرات کو "World Kidney Day" منایا جاتا ہے۔

رِنگ بال

رِنگ بال (Ring Ball) جنوبی افریقہ کا روایتی کھیل ہے۔ یہ کھیل 1907ء سے افریقی ممالک خاص کر جنوبی افریقہ، نمیبیا، بوٹسوانہ، لی سیتھو (Lesotho) بھارت اور ماریشیس وغیرہ میں کھیلا جاتا ہے۔ زنانہ و مردانہ ٹیمیں یہ کھیل کھیل سکتی ہیں۔ ہر ٹیم 9 کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے تین گول سکورر، تین مرکزی

کھلاڑی اور تین دفاعی پوزیشن پر ہوتے ہیں۔ یہ کھیل ایک کورٹ میں کھیلا جاتا ہے جس کا سائز 18m x 27m ہوتا ہے۔ اس کورٹ کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ہر حصہ 9m x 18m پر مشتمل ہوتا ہے۔ کھیل کے دو ہاف ہوتے ہیں۔ ہر ہاف 25 منٹ کا ہوتا ہے۔ درمیان میں تین منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ کھلاڑی گول کی کوشش کرتے ہیں۔ گول کے لیے گیند کو ایک رنگ (Ring) میں پھینکا جاتا ہے۔ ہر کھلاڑی گیند قبضے میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ رنگ اسٹیل کا بنا ہوتا ہے جس کا قطر (Diameter) 450 ملی میٹر اور سطح زمین سے تین میٹر بلند ہوتا ہے۔ گیند عموماً چمڑے کی بنی ہوتی ہے۔ جس کا وزن 450 گرام اور گولائی 69 سے 71 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ ہر گول کے دو پوائنٹس ہوتے ہیں۔ میچ کو ایک ریفری، لائن مین (Lineman) جن کے پاس جھنڈیاں ہوتی ہیں، نگرانی کرتے ہیں۔

انڈرس سیلیئس

انڈرس سیلیئس (Anders Celsius) 27 نومبر 1701ء کو اُپسالا (Uppsala) کے مقام پر سویڈن میں پیدا ہوئے۔ ہم ٹمپریچر کو سینٹی گریڈ میں یا °C سے ظاہر کرتے ہیں۔ ڈگری سی سے مراد "Celsius" ہے۔ یہ مشہور زمانہ ماہر فلکیات، ماہر طبیعیات اور ریاضی دان تھے۔ آپ 1730ء سے 1744ء تک یونیورسٹی آف اُپسالا، سویڈن میں بطور پروفیسر پڑھاتے رہے۔

فلکیات (Astronomy) آپ کا بنیادی مضمون تھا۔ 1730ء میں آپ نے سورج سے زمین کا فاصلہ ماپنے کا طریقہ بتایا۔ اسی کے ساتھ زمین کی مقناطیسی خاصیت پر بھی روشنی ڈالی۔ 1738ء میں زمین کی ہیئت (Geology) پر بھی مقالہ لکھا۔ آپ نے پہلی مرتبہ درجہ حرارت کی پیمائش کا طریقہ بھی بیان کیا۔ آپ نے برف اور کھولتے پانی کا درجہ حرارت سیلیئس (Celsius) میں یعنی اپنے نام سے ظاہر کیا۔ اس کے لیے علامت "°C" استعمال کی جاتی ہے۔ آپ نے ہی اس کو سینٹی گریڈ بھی قرار دیا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے تھرمومیٹر بھی بنایا جو درجۂ حرارت کی پیمائش سینٹی گریڈ میں کرتا تھا۔ اس عظیم سائنس دان نے مختصر عمر پائی اور 25 اپریل 1744ء کو انتقال کر گئے۔ آج بھی درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے فارن ہائیٹ اور کیلون کے علاوہ سیلیئس کا پیمانہ استعمال ہوتا ہے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر (مریض سے): ''تمہاری نبض تو گھڑی کی طرح باقاعدگی سے چل رہی ہے۔''

مریض: ''آپ کی انگلیاں میری گھڑی پر ہیں۔''

(وجیہا کاکاخیل اعزاز اللہ، پشاور)

ماں کو دیکھ کر بچے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ماں نے بچے سے پوچھا: ''کیا بات ہے بیٹا! کیوں رو رہے ہو؟''

بچے نے معصومیت سے جواب دیا: ''میرے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی تھی۔''

ماں نے کہا: ''مگر میں نے تو پہلے تمہاری آواز نہیں سنی۔''

بچے نے جواب دیا: ''میں سمجھا آپ گھر میں نہیں ہیں۔'' ☆

اُستاد (احمد سے): ''اندھا کسے کہتے ہیں؟''

احمد: ''جس کی آنکھیں نہ ہوں۔''

اُستاد: ''شاباش! اور کانا کسے کہتے ہیں؟''

احمد: ''جناب! جس کے کان نہ ہوں۔'' (شیرونیہ شاہ، حیدر آباد)

ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے اُبال لیا کریں۔''

بیوقوف آدمی: ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اُبالنے سے بچہ مر تو نہیں جائے گا۔''

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''آج میں نے ایک بہت بڑے آدمی کی جیب کاٹی ہے۔''

دوسرا دوست: ''تمہیں کسی نے پکڑا نہیں؟''

پہلا دوست: ''مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا کیوں کہ میں درزی ہوں۔''

☆

اُستاد: ''بتاؤ وہ نہا رہے ہیں، میں نہا رہا ہوں، سب نہا رہے ہیں، یہ کون سا زمانہ ہے؟''

شاگرد: ''جناب! یہ عید کا زمانہ ہے۔'' (سارا ارشد، سرگودھا)

مریض (ڈاکٹر سے): ''ڈاکٹر صاحب! آپریشن کے بعد مجھے پیاس بہت لگنے لگی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب: ''معاف کرنا بھائی! میں روئی کا گولا تمہارے پیٹ میں بھول گیا ہوں۔'' ☆

ایک آدمی کے گھر رات بارہ بجے کے قریب فون آیا۔ فون کرنے والے نے پوچھا: ''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

اس نے بڑے غصے سے کہا: ''جہنم سے بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''بس یہی معلوم کرنا تھا کہ آپ جیسا بدتمیز کہیں جنت میں نہ چلا جائے۔'' (احور کامران، لاہور)

دو آدمی لڑ رہے تھے۔ ایک کہنے لگا۔ ''میں نے آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔''

دوسرا آدمی: ''میں نے بھی آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔''

پہلا آدمی: ''آپ تو درست سمجھتے تھے، غلطی پر میں ہی تھا۔''

☆

وکیل (اپنے مؤکل سے): ''اچھا! تو تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو۔ کتنی فیس دو گے؟''

مؤکل: ''میرے پاس ایک خچر، چند مرغیاں اور دو بھیڑیں ہیں، وہ آپ کی نذر کروں گا۔''

وکیل: ''کافی ہے۔ اچھا! یہ بتاؤ، تم پر الزام کن چیزوں کی چوری کا لگایا گیا ہے۔''

مؤکل: ''صرف ایک خچر، چند مرغیاں اور دو بھیڑوں کی چوری کا۔''

اُستاد (حامد سے): ''جو مضمون تم نے گھوڑے پر لکھا ہے، وہ اعجاز کے مضمون سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ تم نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔''

حامد: ''ماسٹر صاحب! ہم دونوں نے ایک ہی گھوڑے پر مضمون لکھا ہے۔ اس لیے ملتا جلتا ہے۔'' (عدیل عارف، سیالکوٹ)

اُستاد: ''بتاؤ سلیم! پاجامہ واحد ہے یا جمع؟''

سلیم: ''اوپر سے واحد، نیچے سے جمع۔'' (نبیل ظفر، لاہور)

ڈاکٹر (مریض کو بل پیش کرتے ہوئے): ''اب تم خدا کے فضل سے تندرست ہو گئے ہو۔''

مریض (بل واپس کرتے ہوئے): ''جب میں خدا کے فضل سے تندرست ہوا ہوں تو آپ پیسے کس بات کے مانگ رہے ہیں؟''

(وسیم ارشد، کوہاٹ)

چکن تکہ پیزا

اجزاء:

پیزا کا تیار بیس: ایک عدد بڑا
چکن تکہ بغیر ہڈی چھوٹی بوٹی: 1/4 کلو
شملہ مرچ، باریک کٹی ہوئی: ایک عدد بڑی
ہری پیاز، باریک کٹی ہوئی: دو عدد
پیزا کا پنیر، کدوکش کیا ہوا: 1 1/2 پیالی
چیڈر پنیر، کدوکش کیا ہوا: 1/2 پیالی
چلی پنیر، کدوکش کیا ہوا: 1/2 پیالی
مکھن: حسبِ ضرورت

پیزا ساس:

ٹماٹر: چھ عدد، درمیانے
تلسی کے پتے: چھ عدد تازہ یا 1/4 چائے کا چمچ خشک پتے
ہری مرچ: چار عدد
لہسن: چھ جوے
لال مرچ پاؤڈر: 1/2 چائے کا چمچ
ٹماٹو کیچپ: دو کھانے کے چمچ
چلی گارلک ساس: تین کھانے کے چمچ
اوریگانو: 1/4 چائے کا چمچ
مکھن: 1/2 کھانے کا چمچ
نمک: حسبِ ذائقہ

ترکیب: پیزا ساس بنانے کے لیے ٹماٹر، لہسن، ہری مرچ اور تلسی کو گرائنڈر میں پیس لیں۔ پتیلی میں مکھن گرم کریں اور اوریگانو کو دھیمی آنچ پر تلیں۔ پسے ہوئے ٹماٹر، چلی ساس اور کیچپ شامل کریں۔ تیز آنچ پر ہلاتے ہوئے پکائیں۔ جب اُبال آنے لگے تو ڈھک کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب ساس گاڑھا ہونے لگے اور مکھن اوپر آ جائے تو چولہا بند کر دیں۔ علیحدہ پیالے میں سب پنیر ملا لیں اور الگ رکھ دیں۔ پیزا بیس پر تھوڑا مکھن لگائیں۔ اس پر تیار کیا ہوا ساس لگائیں۔ اوپر سے مرغی اور سبزی ڈالیں اور پنیر پھیلا دیں۔ تھوڑا مکھن بھی اوپر لگا دیں۔ پہلے سے تیز گرم کیے ہوئے اوون میں ۱۵-۲۰ منٹ کے لیے بیک کریں۔ گارلک بریڈ کے ساتھ گرم پیش کریں۔

میرا پوری مرغ

اجزاء:

مرغی ہڈی کے بغیر: 1 1/2 کلو، چھوٹی بوٹی کر لیں
مکھن: دو کھانے کے چمچ
دہی: ایک پیالی
بادام: بیس عدد
ہری مرچ: بارہ عدد
پودینہ: آٹھ کھانے کے چمچ
دھنیا پاؤڈر: ایک چائے کا چمچ
ہلدی: آدھا چائے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
تیل: چار کھانے کے چمچ
نمک: حسبِ ذائقہ

ترکیب: دہی، مکھن، نمک، پودینہ، ہری مرچ اور بادام کو پیس کر آمیزہ بنا لیں۔ یہ مصالحہ مرغی کو لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پتیلی میں تیل گرم کریں اور مرغی ڈال کر تیز آنچ پر تلیں۔ جب مرغی رنگ بدلنے لگے تو آنچ دھیمی کر کے چند منٹ پکائیں۔ آنچ دوبارہ تیز کر لیں اور مرغی کو اتنا تلیں کہ گل جائے۔ کالی مرچ، ہلدی، لال مرچ اور گرم مصالحہ شامل کر کے ملا لیں اور چند منٹ پکائیں۔ پودینہ چھڑک کر گرم پیش کریں۔ اگر آپ شوربہ رکھنا چاہتے ہیں تو تھوڑا پانی شامل کر کے دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب شوربہ گاڑھا ہو جائے اور تیل اوپر آ جائے تو میرا پوری مرغ شوربے کے ساتھ تیار ہے۔ میتھی پراٹھے یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

کھواڑی کی نگری

(ضلع مانسہرہ کی ایک خوب صورت بستی)

پہاڑوں کے دامن میں اک سرزمیں ہے
بڑی دل ربا دل کشا ہے حسیں ہے
جو سچ پوچھیے تو ارم کے قریں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

بڑے محنتی اس کے پیر و جواں ہیں
تواضع کا وہ ایک زندہ نشاں ہیں
کوئی ان کا ہم سر نہ دیکھا کہیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

میسر کسی کو جو نانِ جویں ہے
دلاور کوئی اس سے بڑھ کر نہیں ہے
چٹانوں سے مضبوط یاں کا مکیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

کوئی باغ پھولوں پھلوں کے لگائے
کوئی موسمی سبزیاں ہی اُگائے
بڑی بخت آور یہاں کی زمیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

یہ بستی ہے اک سبزہ زاروں کی دُنیا
کہیں پھوٹتی آبشاروں کی دُنیا
یہ فطرت کی رنگینیوں کی امیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

کہیں بادلوں کا وہ گھر گھر کے آنا
کہیں ژالہ باری کا منظر سہانا
عجب سندر سپنوں کی یہ سرزمیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

تخیل کو اک ولولہ دینے والے
مناظر یہاں کے انوکھے نرالے
کوئی کس طرح اپنے دل کو سنبھالے
ضیاء کہہ رہا ہے ہر کوئی بالیقیں ہے
کھواڑی کی نگری بڑی دل نشیں ہے

محمد شرافت علی ضیاء

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ

غلام حسین میمن

شیخ نور محمد کی نیکی اور پرہیزگاری کی بدولت سارے شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ انہیں بزرگوں کے پاس بیٹھنے اور دین کی باتیں سیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسلام سے محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کا سیال کوٹ میں چھوٹا سا کاروبار تھا۔

شیخ نور محمد کا ایک بیٹا عطا محمد تھا۔ وہ جب تیرہ سال کا ہوا تو شیخ نور محمد کے گھر 9 نومبر 1877ء کو محمد اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ وہ جب بڑے ہوئے تو شیخ نور محمد کو ان کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ شیخ نور محمد کے ایک دوست مولوی میر حسن بھی تھے جو ایک مشن اسکول میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ جو کچھ پڑھاتے تھے، وہ دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ انہی مولوی میر حسن کے شاگرد اقبال بھی بنے۔

ابھی اقبال چوتھی جماعت میں ہی تھے کہ ایک روز ان کے والد شیخ نور محمد کو خیال آیا اور انہوں نے اس کا اظہار مولوی میر حسن سے کیا:

''میں سوچ رہا ہوں کہ اقبال آخر انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا، کیوں نہ اسے مذہب کی تعلیم دی جائے جس سے اس کی آخرت بھی سنور جائے۔ میرا خیال ہے یہ اسکول کے بجائے مدرسے میں ہی آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے۔''

مولوی میر حسن نے بڑی خاموشی سے اپنے دوست کی باتیں سنیں۔ وہ اپنے شاگرد اقبال کے جوہر دیکھ چکے تھے۔ اقبال میں اچھا شعری ذوق تھا۔ وہ اکثر کتابیں پڑھتے رہتے یا فارغ اوقات میں سوچتے رہتے۔ مولوی میر حسن کہنے لگے:

''یہ بچہ مسجد میں پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ اسکول میں پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔''

علامہ اقبال کو شروع ہی سے شاعری سے دل چسپی تھی۔ مولانا رومؒ فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ان کی مثنوی کی مشہور کتاب ہے جس میں انہوں نے نیکی کا درس دیا ہے۔ اس میں مزے مزے کی حکایتیں ہیں۔ اقبال کے والد بھی مثنوی مولانا رومؒ کے عاشق تھے۔ اقبال کے شاعری کے شوق نے مزید سفر طے کیا اور وہ خود شعر کہنے لگے۔ ان دنوں ہندوستان میں ''مرزا داغ دہلوی'' کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ انہیں اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ اقبال نے بھی یہی کیا اور بذریعہ ڈاک اپنا کلام بھیج دیا۔ ان دنوں مرزا داغ دہلوی کا قیام حیدر آباد دکن میں تھا۔ حیدر آباد دکن اس وقت ایک خوش حال مسلمان ریاست تھی۔ وہاں سے کلام صحیح ہو کر آیا۔ اس نے اقبال کی کافی ہمت بڑھائی۔ اُستاد محترم مولوی میر حسن بھی ان کی

شاعری کے قائل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اقبال مشاعروں میں بھی اپنا کلام پڑھنے لگے۔

اسی دوران وہ برابر اپنے تعلیمی مراحل طے کرتے رہے۔ انہوں نے سیال کوٹ کے مشن کالج سے ایف اے کیا۔ اس کے بعد وہ لاہور آ گئے جہاں کے مشہور تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج سے انہوں نے بی اے کیا۔ یہ اقبال کی زندگی کا نیا دور تھا۔ یہاں ان کی کئی قابل اساتذہ سے ملاقات ہوئی جن میں سے ایک پروفیسر آرنلڈ بھی تھے۔ یہ اقبال کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں سیال کوٹ میں مولوی میر حسن جیسا اُستاد ملا اور لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت میسر آئی۔

لاہور کے مشاعروں میں اقبال بھی اپنا کلام سنانے لگے۔ انہی دنوں ایک مشاعرے میں اقبال نظم سناتے ہوئے اس شعر تک آئے۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

تو ایک بزرگ شاعر مرزا ارشد نے تڑپ کر کہا:

''میاں صاحب زادے، سبحان اللہ! اس عمر میں یہ شعر!''

اقبال کا تعلیمی سفر اور شاعری ساتھ ساتھ جاری رہی۔ وہ اگرچہ شروع میں داغ دہلوی سے اصلاح لے چکے تھے، مگر ان پر مرزا غالب اور مولانا الطاف حسین حالؔی کا زیادہ اثر تھا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی قومی شاعری اور اسلامی واقعات کو اپنے اشعار میں بیان کرنے کا فن جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم مسدس میں اس فن کا خوب استعمال بھی کیا ہے۔

اقبال بھی ہندوستان کے حالات دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے اور اپنی شاعری میں اس درد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ان ہی دنوں اقبال نے بچوں کے لیے بھی بڑی شان دار نظمیں لکھیں جن میں مکڑا اور مکھی، پہاڑ اور گلہری، بچے کی دُعا، ہمدردی، ماں کا خواب اور پرندے کی فریاد وغیرہ شامل ہیں۔

اقبال ان دنوں اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے ایک دوست سر شیخ عبدالقادر تھے جو ایک ادبی رسالہ ''مخزن'' نکالتے تھے۔ اقبال کی نظمیں پہلے مخزن میں چھپتی تھیں اور پھر ہندوستان بھر میں مشہور ہوئیں۔

ان ہی دنوں ان کے ایک اُستاد پروفیسر آرنلڈ ملازمت کی مدت ختم کر کے انگلستان واپس چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی اُستاد کے ملک چلے گئے۔ انگلستان پہنچ کر انہوں نے کیمبرج یونی ورسٹی سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کی ملاقات بڑے بڑے فلاسفروں سے ہوئی جن میں میک ٹیگرٹ اور پروفیسر براؤن شامل ہیں۔

کیمبرج سے فلسفے کی تعلیم اور جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جرمنی سے واپس آ کر لندن سے بیرسٹری (قانون) کا امتحان پاس کیا۔ آرنلڈ صاحب ان دنوں لندن یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ چھٹی پر گئے تو اقبال نے ان کی جگہ چھ ماہ تک پڑھایا۔

انگلستان سے واپس آ کر اقبال نے اُردو کے ساتھ فارسی میں بھی اشعار کہنے شروع کیے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج میں دوبارہ پڑھانا شروع کیا۔ انہیں اس کے ساتھ وکالت کرنے کی بھی اجازت تھی۔

ان ہی دنوں اقبال کی دوسری نظموں کے ساتھ ساتھ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' نے بھی بڑی دھوم مچائی۔ جس طرح اقبال الطاف حسین حالؔی کا احترام کرتے تھے، وہ بھی ان سے محبت اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اقبال کی تعریف کرنے والوں میں سید سلیمان ندوی اور اکبر الٰہ آبادی بھی شامل تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے تو لاہور آ کر اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔

اقبال نے کچھ عرصے بعد گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ میں ملازم رہ کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اب ان کا گزارا وکالت سے ملنے والی آمدنی پر تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ کی شاعری کا چرچا برابر عام ہوتا رہا اور وہ اپنی قوم کو جگاتے رہے۔ ان کی شاعری اُمید اور جدوجہد کی شاعری ہے جو ہندوستان کے محکوم اور مظلوم مسلمانوں کو عزت سے جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ انہوں نے خوابیدہ مسلمانوں کو جگایا۔ انہوں نے اپنی شاعری سے وہ کام لیا جو ایک لیڈر آزادی کے لیے مسلح ہو کر کرتا ہے۔ وہ پاکستان کے علاوہ بھارت اور ایران میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ ان کی شاعری مظلوم قوموں اور لوگوں کو حوصلہ دیتی ہے۔ انہیں شاعرِ مشرق بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں انتقال فرمایا اور بادشاہی مسجد لاہور کے احاطے میں دفن ہیں۔

☆☆☆

کھوج لگایئے!

صالحہ کی خالہ امریکہ میں رہتی تھی۔ وہ بہت عرصے بعد اپنے والدین سے ملنے پاکستان آئی۔ ان کے تین بچے حمزہ، کاشف اور علیزہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سب لوگ خالہ جان اور ان کے بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ خالہ جان کو لاہور کی سیر بھی کرائی گئی۔ بچوں نے ضد کی کہ چڑیا گھر کی سیر بھی کرائی جائے، لہٰذا اتوار کے دن ابا جان نے چڑیا گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ سب بچوں نے خوب صورت کپڑے پہنے اور امی جان نے بھی کھانے پینے کی چیزیں تیار کیں۔ ابا جان بہت سا پھل بھی لائے جو ٹوکریوں میں رکھا گیا۔ موسم بہت سہانا تھا اور نومبر کی ہلکی ہلکی سردی کا آغاز ہوا۔ سب تیار ہو کر کار میں بیٹھے اور چڑیا گھر پہنچ گئے۔

بچوں نے بہت سارے جانور ببر شیر، چیتا، ہاتھی، دریائی گھوڑا اور کئی دوسرے جانور بھی دیکھے۔ اب بچے پرندوں کے پنجرے کے پاس کھڑے تھے۔ پرندے بہت خوب صورت اور رنگ برنگے تھے۔ ساتھ ہی ایک میدان میں بڑے پرندے بھی تھے۔ پرندے دیکھ کر وہ سب کینٹین کی طرف بڑھے۔ خالہ جان نے بچوں سے پوچھا، سب کو یاد ہے کہ کون کون سے پرندے دیکھے ہیں۔ سب نے ہاں میں جواب دیا۔ خالہ جان نے ان کی یادداشت آزمانے کے لیے پوچھا۔ ''وہ کون سا پرندہ ہے جس کے نام کے چھ حروف ہیں۔ اگر آخری تین حرف ہٹا دیں تو ایک بہت بڑے بے ڈھنگے جانور کا نام بن جاتا ہے اور اگر شروع کے تین حرف ہٹا دیں تو ایک چھوٹے سے گھریلو جانور کا نام بن جاتا ہے۔''

پیارے بچو! آپ بھی سوچیے اور پرندے کا نام بتایئے؟

پیارے بچو! اکتوبر 2016ء کے کھوج لگایئے کا جواب یہ ہے: سعدیہ بشیر ہی ملازمہ کی قاتلہ تھی۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ سعدیہ معذور ہونے کا ڈرامہ کر رہی تھی کیوں کہ فرش پر پاؤں کے نشانات تھے۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- حافظ ثناء عروج، فیصل آباد
2- شازیہ ہاشم، قصور
3- حمیرا ریاست، واہ کینٹ
4- فاطمہ زہرا، راولپنڈی
5- سیدہ کشف گیلانی، لاہور

چمپو اور بھالو بہت اچھے دوست تھے۔ دونوں جنگل کے اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے مگر دونوں کی صحت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ چمپو کمزور اور دبلا پتلا سا تھا اور ہر وقت پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ جب کہ بھالو خوب صحت مند تھا اور وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی خوب حصہ لیتا تھا۔ چمپو کا رنگ بھورا تھا اور وہ جنگل کے جنوبی حصے میں بندروں کی بڑی بستی میں رہتا تھا جب کہ بھالو کا رنگ سیاہ تھا اور وہ جنگل کے شمال میں رہنے والے سیاہ ریچھوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

ایک دن چمپو نے بھالو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ بھالو بھائی! تمہاری صحت کا راز کیا ہے؟ تو بھالو نے جواب میں اسے بتایا کہ وہ روزانہ ناشتے میں شہد استعمال کرتا ہے اور خوب ورزش بھی کرتا ہے۔

چمپو بے چارے نے آج تک شہد کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ اسے تو کبھی ناشتے میں آدھا ناریل یا کوئی اور پھل ملتا اور بعض اوقات تو اسے درختوں کے پتوں سے پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔

''بھالو بھائی! شہد کیسا ہوتا ہے؟ کیا اس میں بہت طاقت ہوتی ہے؟'' چمپو نے بھالو کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سچ میں بہت میٹھا ہوتا ہے اور اس میں طاقت بھی بہت ہوتی ہے۔'' بھالو نے اسے مزے لے لے کر بتایا تو چمپو کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اچھا! کسی روز مجھے بھی اس کا ذائقہ چکھاؤ۔'' چمپو نے منہ میں آئے پانی کو حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ کون سی بڑی بات ہے۔'' بھالو نے ہامی بھرتے ہوئے کہا تو چمپو خوشی سے چہک اُٹھا۔

اگلے روز جب چمپو اسکول پہنچا تو بھالو نے اپنا ٹفن ہوا میں لہراتے ہوئے اسے اشارے سے بتایا کہ وہ اس کے لیے شہد لایا ہے۔ چمپو کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ اب اس کا دھیان پڑھائی سے زیادہ شہد کی طرف ہو چکا تھا مگر جماعت میں اُستاد موجود ہونے کی وجہ سے وہ بھالو سے ٹفن لے کر شہد نہیں کھا سکتا تھا۔ اب اس کی نظر بار بار گھڑی کی طرف اُٹھ رہی تھی اور اسے بڑی شدت سے تفریح کی گھنٹی بجنے کا انتظار تھا۔

جب بوڑھے زرافے نے تفریح کی گھنٹی بجائی تو چمپو تیزی سے بھالو کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے۔

بھالو نے اپنے ٹفن کا ڈھکن کھولا اور ٹفن چمپو کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''لو چکھو اور بتاؤ شہد کا مزا کیسا ہے؟''

چمپو نے شہد چکھا تو وہ واقعی بہت میٹھا اور مزے دار تھا۔ ''واہ! مزا آ گیا۔'' چمپو نے شہد سے بھری انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی بھالو کا شکریہ بھی ادا کیا۔

اس روز کے بعد سے چمپو بھالو سے بہانے بہانے سے شہد کی جگہ اور اسے حاصل کرنے کے طریقے پوچھتا رہتا۔

بھالو نے اسے بتایا کہ یہ ان کا جدی پشتی کام ہے یعنی اس کے آباء و اجداد عرصے سے یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس نے چمپو کو یہ بھی بتایا کہ چھتے سے شہد حاصل کرنا اس نے اپنے والد سے سیکھا ہے۔ اس کام میں بعض اوقات شہد کی مکھیاں ان پر حملہ بھی کر دیتی ہیں۔ چمپو بھالو کی ہر بات غور سے سنتا تھا، وہ اس دوران اپنے بالوں میں سے جوئیں بھی نہیں نکالتا تھا۔

اس دن اسکول سے چھٹی تھی۔ چمپو سو کر دیر سے اُٹھا تھا۔ اس کی ماں نے اسے ناشتے کے لیے ایک ٹوٹا ہوا ناریل دیا تو اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے ناریل پرے دھکیل دیا۔ آج اس کا ناریل کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ گھر سے نکلا اور بھالو کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جنگل کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں انگوروں کی لمبی اور گھنی بیلیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بیلوں پر انگوروں کے گچھے لٹک رہے تھے۔

ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ کھٹے میٹھے انگور کھائے مگر پھر اس نے سوچا کہ وہ اتنی دُور سے شہد کھانے آیا ہے، اس لیے اس شہد تلاش کرنا چاہیے۔ بھالو نے اسے بتایا تھا کہ انگور کی بیلوں کے نیچے بڑے بڑے چھتے لگے ہوئے ہیں۔ وہ بیلوں اور ٹہنیوں کے ساتھ لٹکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی اسے بیلوں کے اندر کوئی بڑی سی سیاہ رنگ کی چیز نظر آئی۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر دیکھا تو بڑا سا شہد کی مکھیوں کا چھتا اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ چھتے پر نظر پڑتے ہی شہد کا سوچ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

وہ شہد حاصل کرنے کے لیے جلدی سے چھتے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اب اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ چھتے کے کون سے حصے میں شہد ہو گا۔ اس نے شہد حاصل کرنے کے لیے چھتے کے ایک طرف ہاتھ مارا۔ جونہی اس کا ہاتھ چھتے کو لگا۔ ایک زوردار بھنبھناہٹ گونجی اور سینکڑوں کی تعداد میں مکھیوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ڈنگ مارنا شروع کر دیئے۔ چمپو کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر ایسا حملہ ہو سکتا ہے۔ وہ درد اور تکلیف سے چلاّتا ہوا جان بچانے کے لیے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا مگر مکھیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بہت سی مکھیاں اس کے چہرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ کچھ اس کے بالوں میں گھس کر اس کے جسم پر کاٹ رہی تھیں۔ وہ جنگل میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا اور پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ جنگل کے اسپتال میں تھا۔ جنگل کا سرکاری ڈاکٹر اسے انجکشن لگا رہا تھا۔ سوجن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اس کے کانوں میں بھالو کی آواز پڑی جو بڑی فکرمندی سے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ اس کے دوست کی جان تو بچ جائے گی ناں!

ڈاکٹر کے ٹیکہ لگانے کے تھوڑی دیر بعد اسے قے آنا شروع ہو گئی۔ زرد رنگ کا مادہ اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ زہر ہے جو انجکشن لگانے کی وجہ سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے امی اور ابو بھی اس دوران اسپتال میں پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں چمپو کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھے۔ چمپو کی ماں بار بار اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ قے آنے کی وجہ سے چمپو کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر ہو چکی تھی۔ بھالو نے چمپو کی ماں کو بتایا کہ وہ شور کی آواز سن کر اس طرف آیا تو اسے چمپو ایک جگہ بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ چند مکھیاں اب بھی اس پر منڈلا رہی تھیں۔ اس نے فوراً چمپو کو اُٹھایا اور اسے اسپتال لے آیا۔

چمپو کی ماں نے بھالو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! تم نے بہت اچھا کیا جو اسے اُٹھا کر اسپتال لے آئے، ورنہ اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ چمپو کی ماں نے جب چمپو سے گلہ کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! تمہیں گھر والوں کو بتا کر جانا چاہیے تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو تو چمپو کو بہت شرمندگی اور افسوس ہوا۔ اس نے فوراً اپنی ماں سے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ وہ آئندہ اس سے پوچھ کر گھر سے باہر جایا کرے گا اور کسی کی دیکھا دیکھی کوئی الٹا سیدھا کام بھی نہیں کرے گا۔

ڈاکٹر نے چمپو کو ایک اور انجکشن لگانے کے بعد اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی اسے چند روز تک آرام کرنے کی ہدایت بھی کی۔ چمپو کے والدین اسے اسپتال سے گھر لے آئے۔ سوجن اور کمزوری کی وجہ سے وہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہا اور آئندہ اس نے والدین کی نافرمانی اور شہد کھانے سے بھی توبہ کر لی۔ ☆☆☆

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ نبی ﷺ کے نام ''محمد'' کا لغوی مطلب کیا ہے؟

i۔ رحمت ii۔ تعریف کیا گیا iii۔ شفاعت کرنے والا

2۔ ٹیلی فون کے موجد گراہم بیل کا تعلق کس ملک سے تھا؟

i۔ امریکہ ii۔ اسکاٹ لینڈ iii۔ جرمنی

3۔ یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

یہ اشعار بال جبریل سے لیے گئے ہیں، نظم کا عنوان بتایئے؟

i۔ دُعا ii۔ طارق کی دُعا iii۔ مسجد قرطبہ

4۔ کروموسوم کس شکل میں ہوتے ہیں؟

i۔ دھاگہ نما شکل ii۔ جھلی نما شکل iii۔ گول شکل

5۔ شاہینوں کا شہر پاکستان کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ سیال کوٹ ii۔ پشاور iii۔ سرگودھا

6۔ بچوں کا عالمی دن کب منایا جاتا ہے؟

i۔ 20 نومبر ii۔ 21 نومبر iii۔ 22 نومبر

7۔ علامہ اقبالؒ نے گورنمنٹ کالج میں انگریزی، عربی اور فلسفے کی تعلیم کس اُستاد سے حاصل کی؟

i۔ پروفیسر آرنلڈ ii۔ مولانا میر حسن iii۔ پروفیسر نکلسن

8۔ موسیقی کا آلہ ''ستار'' کس کی ایجاد ہے؟

i۔ بادشاہ اکبر ii۔ امیر خسرو iii۔ تان سین

9۔ دھوپ سے جسم میں کون سے حیاتین بنتے ہیں؟

i۔ وٹامن اے ii۔ وٹامن ڈی iii۔ وٹامن سی

10۔ علامہ اقبالؒ کی والدہ کا نام کیا تھا؟

i۔ مریم بی بی ii۔ امام بی بی iii۔ کریم بی بی

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2016ء

1- صلح حدیبیہ 2- اندھا تھا 3- لاطینی 4- گنی

5- ملتان 6- محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی 7-1961ء

8- روشن خان 9- بحیرہ احمر 10- کونین

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ ایمل فاطمہ، نوشہرہ (150 روپے کی کتب)

☆ مدحت حامد، واہ کینٹ (100 روپے کی کتب)

☆ حاشر الاسلام، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

عادل آصف، قصور۔ زہرا امجد، راول پنڈی۔ محمد عمر فاروق، سیال کوٹ۔ سمیعہ ذوالفقار، کراچی۔ سید محمد حسین شاہ، حیدر آباد۔ ثمر نثار، راول پنڈی۔ عائشہ شہزاد، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ فاطمہ احمد، گوجرانوالہ۔ محمد فہد بٹ، جہلم۔ محمد حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ محمد صدیق قیوم، قصور۔ معیز احمد، کراچی۔ حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ عبداللہ ارشد، لاہور۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ ردا بٹ، لاہور۔ محمد مجیر، ڈیرہ غازی خان۔ مشعال آصف، لاہور۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ رضوان اللہ، اسلام آباد۔ شازیہ ہاشم، کھڈیاں خاص۔ تحریم، گجرات۔ بانیہ آصف، لاہور۔ علی طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ انوشہ خالد، راول پنڈی۔ علینا اختر، کراچی۔ شہریار کفیل، گوجرانوالہ۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ اسماء ظفر راجہ، مری۔ مہک خالد شیخ، لاہور۔ سدرہ ممتاز، کراچی۔ ثمینہ بلال، مری۔ ثوبیہ فہیم، سیال کوٹ۔ تنویر جمال، کراچی۔ عائشہ کاردار، فرح کاردار، لاہور۔ صالحہ ناز، سعدیہ اکبر، کوئٹہ۔ لالہ رُخ، گجرات۔ محمد احمد، کاظمہ زہرہ، احور کامران، لاہور۔ عامرہ جمال، بشریٰ خلیل، پشاور۔ صفیہ فاطمہ، ڈیرہ غازی خان۔ رقیہ بتول، بہاول پور۔ نادیہ جمیل، کراچی۔ ثمرہ بخاری، مہک بتول، ڈیرہ اسماعیل خان۔ نور فاطمہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ احمد خان، پشاور۔ اصغر علی، لاہور۔ کامران علی، منڈی بہاؤ الدین۔ عمران احمد، گوجرانوالہ۔ نفیس احمد صدیقی، چیچہ وطنی۔ سلیم احمد چشتی، قصور۔ ہارون صدیقی، ایبٹ آباد۔ شاہدہ تصور، ملتان۔ عطیہ بشیر، بہاول پور۔ آصف نواز، کراچی۔

نیکی یا بیگار

محمد اسلم

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور چار بھائیوں کے خاندان میں، جس میں میرے والد سب سے بڑے تھے، پیدا ہونے والا پہلا لڑکا تھا۔ میری پیدائش بہت سی دعاؤں، منتوں اور بزرگوں کے بتائے ہوئے وظائف کا نتیجہ تھی جس پر میرے والد نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر جشن منایا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا اور ہیجڑوں نے وقت کے مقبول گانے بے سرے انداز میں گا گا کر خوب شور مچایا۔

بچپن میں میری حفاظت ایک قیمتی اثاثے کے طور پر کی جاتی تھی اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے درمیان مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ جب کبھی بیمار پڑتا سارا خاندان پریشان ہو جاتا اور روزگار کا فکر ایک طرف رکھ کر سب لوگ میری صحت یابی کے لیے جت جاتے۔ کوئی انگریزی دوا کا نسخہ لے آتا، کوئی پنساری کی دُکان سے پُڑے لے آتا اور کوئی دم درود کرنے والوں سے تعویذ دھاگہ۔ لیکن ان سب باتوں سے بڑھ کر میرے والدین کو جس بات پر زیادہ اعتماد تھا وہ تھی مالش، بیماری کے دوران صبح و شام وہ میری ٹانگوں اور کمر پر سرسوں کے تیل سے مالش کرتے اور سردی گرمی سے بچانے کا حتی المقدور اہتمام کرتے۔

میرے والد ایک شریف النفس انسان تھے جو پانچ وقت کی نماز کے ساتھ پوری محنت سے میرے اور میری بہنوں کے لیے دال روٹی کماتے، تاہم بیٹا ہونے کی حیثیت سے کھانے پینے میں مجھے بہنوں پر ترجیح دی جاتی اور میری پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا۔

پانچ چھ سال کی عمر میں مجھے ساتھ والے محلے کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں ہم صبح صبح ٹاٹوں کو جھاڑتے ہوئے اپنے بالوں کی مزید کھچڑی بناتے اور باقی وقت بید کی مار کھا کر سبق یاد کرتے۔ میں چوں کہ اکثر بیمار رہتا تھا، میرے والدین کو ہر دم میری فکر رہتی۔ میرے اسکول سے گھر واپس آنے تک وہ بے چین رہتے اور صبح شام اُٹھتے بیٹھتے وہ مجھے لڑائی جھگڑے سے دُور رہنے اور دوسروں سے حسنِ سلوک کی نصیحت کرتے رہتے۔ نتیجتاً میں اسکول میں اپنے ساتھیوں کی مدد کر کے خوش ہوتا اور مزید نیکی کرنے کے مواقع تلاش کرتا۔ تب مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ نیکی کرنے اور اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کا کیا فرق ہوتا ہے۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور اسکول بائیسکل پر جاتا تھا۔ میرا ایک کلاس فیلو عبدالمجید میرے گھر سے آگے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ اسکول کے سامنے گزرنے والی

سڑک پر مشرق کی طرف میرا گھر تھا اور وہاں سے بائیں رُخ کچے راستے سے گزر کر شہر کے مضافات میں عبدالمجید کی بستی تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا اور میں 'تفریح' کے پیریڈ میں اسکول کی گراؤنڈ میں لگے شیشم کے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا تھا۔ عبدالمجید بھی وہاں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ''گرمی تو بڑھتی جا رہی ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر عبدالمجید بولا۔ ''تم تو سائیکل پر آتے ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''چھٹی کے وقت گرمی بہت ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

میں خاموش رہا تو وہ دوبارہ بولا۔

''میں تمہارے ساتھ سائیکل پر بیٹھ جایا کروں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بغیر توقف کے کہا۔

اور یوں چھٹی کے وقت عبدالمجید میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھر آنے پر میں نے سائیکل کو روکا تو وہ اُترنے سے جھجک رہا تھا اور جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہماری بستی میں آم کے درخت پر طوطا اور اس کے بچے ہیں...... دیکھو گے؟''

میں اس کی چال کو نہ سمجھ سکا اور طوطا اور اس کے بچے دیکھنے کے لیے میں اسے بستی تک چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور سائیکل اس کے گھر کو جانے والے کچے راستے پر ڈال دی۔

گرمیوں کی تپتی دوپہر کو تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد عبدالمجید کی بستی آ گئی اور اس نے مجھے سائیکل روکنے کو کہا۔ وہ مجھے کھیتوں سے گزر کر ایک آم کے درخت کے پاس لے آیا اور زمین سے سات آٹھ فٹ کی اونچائی پر اس نے تنے میں کھوہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''یہاں طوطے اور اس کے بچے ہوتے ہیں۔''

''لیکن اس وقت تو اس میں کچھ نہیں......'' میں نے مایوس ہو کر کہا۔

''ہاں...... شاید دانہ چگنے گئے ہوں گے۔'' اس نے ہوشیاری سے جواب دیا اور میں اپنی سادگی میں گھر آ گیا۔

اس دن کے بعد سے یہ معمول ہو گیا کہ چھٹی کے بعد عبدالمجید میرے سائیکل پر سوار ہو جاتا اور میں اسے اس کے گھر چھوڑ آتا۔ میرے گھر والوں کو دیر سے گھر پہنچنے کی وجہ معلوم ہوئی تو والد صاحب نے مجھے اس بیگار سے منع کیا لیکن میں نیکی کے جذبے سے اتنا مغلوب ہو چکا تھا کہ مجھے ان کی بات سمجھ نہ آئی اور یہ معمول تب تک جاری رہا جب تک میں شدید گرمی میں دو تین میل سائیکل چلانے سے بیمار نہیں پڑ گیا۔

جب میں آٹھویں جماعت میں تھا، مجھے کسی کام سے اپنی بہن کے گاؤں جانا پڑا۔ یہ گاؤں تقریباً ساٹھ میل کی دُوری پر تھا جہاں ایک بس جاتی تھی۔ (بقیہ صفحہ نمبر 14)

ل	ی	ب	ہ	ق	خ	ص	د	ش	ط
ا	ن	ڈ	ی	ا	ژ	ع	م	ے	ک
ے	ت	ن	ا	ت	س	ک	ا	پ	ی
ڑ	س	و	ڈ	ا	ن	ش	ظ	ج	ن
غ	ج	ا	پ	ا	ن	ء	ل	ر	ی
س	ی	م	ہ	ذ	ش	ع	گ	م	ڈ
ن	ا	ڈ	ن	گ	و	ی	ز	ن	ا
ا	ک	م	ش	ڑ	چ	ن	ا	ی	ز
ر	ن	ا	ن	ب	ل	گ	ح	ٹ	ض
ف	ء	ظ	ض	ع	ا	ی	ر	ا	ن

آپ نے حروف ملا کر دس ملکوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

پاکستان، فرانس، ایران، جرمنی، لبنان، جاپان، یوگنڈا، کینیڈا، سوڈان، انڈیا

قاسم تیار ہونے کے بعد اپنے کمرے سے نکلا اور سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں اس کی بڑی بہن نازیہ صوفے پر بیٹھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس نے جب قاسم کو دیکھا تو بولی۔ ''قاسم! کہاں جا رہے ہو؟''

''باجی! میں اپنے دوستوں کے ساتھ فورٹ منرو جا رہا ہوں۔'' قاسم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر گیراج میں پہنچا جہاں ایک جدید ماڈل کی نئی کار کھڑی تھی جب کہ ڈرائیور وہاں موجود نہیں تھا۔ قاسم واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''باجی! ڈرائیور کہاں ہے؟''

''ڈرائیور آج چھٹی پر ہے۔''

''کیوں؟''

''اس کی بیٹی بیمار ہے۔ اس لئے اس نے چھٹی کی ہے۔'' باجی نے کہا۔

''اُفوہ! اب میں فورٹ منرو کیسے جاؤں؟'' قاسم نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تمہارے کسی دوست کے پاس کار نہیں ہے؟'' باجی نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دوست کے پاس ہے مگر ہم آٹھ دوست ہیں۔ ہم آٹھ دوست تو ایک کار میں نہیں بیٹھ سکتے ناں۔''

''اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' باجی نے کندھے اُچکائے۔

''باجی! کار کی چابی کس کے پاس ہے؟'' قاسم کو چابی کا خیال آیا تو اس نے پوچھ لیا۔

''امی کے پاس ہے۔''

''آپ کو پتا ہے امی نے چابی کہاں رکھی ہے؟''

''امی نے چابی شاید اپنے کمرے کی الماری میں رکھی ہو گی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' نازیہ باجی نے کتاب بند کر کے صوفے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں خود کار لے جاؤں گا۔''

اسی اثنا میں قاسم کی امی بھی آ گئیں۔ انہوں نے جب قاسم کو تیار دیکھا تو پوچھنے لگیں۔ ''قاسم! کہاں کی تیاری ہے؟''

''امی! آپ کو کل بتایا تو تھا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ فورٹ منرو کی سیر کے لئے جا رہا ہوں۔ ڈرائیور تو چھٹی پر ہے، آپ مجھے کار کی چابی دے دیں، میں کار لے جاؤں گا۔'' قاسم نے جواب دیتے ہوئے کہا تو اس کی امی متعجب ہوئیں۔

''اچھا بیٹا! چابی دیتی ہوں مگر میری بات غور سے سنو، کار احتیاط سے اور ہلکی رفتار میں چلانا، راستہ بہت دشوار گزار اور خطرناک

ہے۔ وہاں پہلے بھی کئی حادثے ہو چکے ہیں۔'' امی نے قاسم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں امی۔ میں کار احتیاط سے چلاؤں گا۔''

قاسم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے امی سے چابی لی اور کار میں سوار ہو کر اپنے دوست علی کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

قاسم کی عمر ساڑھے سترہ سال تھی اور وہ انٹر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ دو بہن بھائی تھے۔ نازیہ اس سے تین سال بڑی تھی اور بی اے کی طالبہ تھی۔ ان کے والد کی اپنی ٹیکسٹائل مل تھی جس کی وجہ سے ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ دُنیا کی ہر آسائش ان کے پاس تھی۔ قاسم نے نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اُس وقت بھی وہ انتہائی تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدہام تھا۔ ہر کسی کو جلدی تھی۔ کسی کو کسی دوسرے کا کچھ خیال نہ تھا۔ سامنے ہی ایک پل تھا جس کے نیچے سے ٹرینیں گزرتی تھیں۔ اُس پل پر بھی بہت رش ہوتا تھا۔ قاسم کو اسی پل سے گزرنا تھا۔ اس نے کار پل پر چڑھائی اور اس کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اس سے آگے ایک آٹو رکشہ جا رہا تھا۔ اس آٹو رکشے کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل بھی جا رہی تھی جس پر ایک آدمی اور چار سال کا ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ قاسم نے آٹو رکشے کو کراس کرتے ہوئے آگے نکلنا چاہا تو اچانک اس کی کار کی سائیڈ موٹر سائیکل کو لگ گئی اور موٹر سائیکل سوار سڑک پر گر گئے۔ قاسم نے موٹر سائیکل سواروں کو سڑک پر گرتے دیکھ لیا تھا جس کے باعث وہ گھبرا گیا تھا۔ اس نے کار کو روکنے کی بجائے اس کی رفتار تیز کر دی تھی اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ رُک گیا تو لوگ اس کو ماریں گے۔ اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ ٹریفک رُک گئی تھی اور جائے حادثہ پر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ قاسم نے پل سے اترتے ہی کار دوسری سڑک کی طرف موڑی اور رفتار میں اضافہ کر دیا۔ وہ قدرے گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں کسی نے اس کی کار کا نمبر نوٹ نہ کر لیا ہو، اس طرح وہ کسی مشکل میں پھنس سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ علی کے گھر پہنچ گیا جہاں اس کے سارے دوست جمع تھے۔ قاسم کار سے اُترا تو اس کے سارے دوست باہر آ گئے۔

''قاسم! گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' علی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''علی! ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

''ایکسیڈنٹ، کس کا؟'' احسن نے چونک کر پوچھا۔

''میری کار کی سائیڈ ایک موٹر سائیکل والے کو لگ گئی تھی۔'' قاسم نے جواب دیا۔ ''قصور میرا نہیں تھا۔ میں تو اپنی سائیڈ سے کار نکال رہا تھا کہ موٹر سائیکل والا میری کار سے ٹکرا گیا۔''

قصور قاسم کا تھا مگر اس نے جھوٹ بول دیا تھا۔

''موٹر سائیکل سوار تو بچ گئے ہیں نا؟'' یونس نے مداخلت کی۔

''مجھے معلوم نہیں ہے، کیوں کہ میں جائے حادثہ پر نہیں رُکا تھا۔'' قاسم نے کہا۔

''قاسم! یہ تم نے بہت غلط کام کیا ہے، کم سے کم وہاں رُک ہی جاتے، شاید زخمیوں کو تمہاری مدد کی ضرورت ہوتی۔'' اکبر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر میں رُک جاتا تو لوگوں نے مجھے مارنا بھی تھا۔'' قاسم نے نہ رُکنے کی وجہ بتائی۔

''قاسم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگر یہ رُک جاتا تو مشتعل لوگ اس کی کار کو نقصان پہنچا دیتے اور اسے پولیس کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔'' ریاض نے قاسم کی حمایت میں بولتے ہوئے کہا۔

''بہرحال اب کیا ارادہ ہے۔ فورٹ منرو چلنا ہے یا نہیں۔'' قاسم نے پوچھا۔

''چلنا ہے۔ تم سب کار میں بیٹھو میں اپنی کار نکال لاتا ہوں۔'' علی نے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔

تھوڑی دیر کے بعد آٹھوں دوست دو کاروں میں سوار فورٹ منرو کی طرف جا رہے تھے۔ قاسم کی کار آگے تھی جب کہ علی کی کار پیچھے۔ پھر جیسے ہی دونوں کاریں چوک پر پہنچیں تو وہاں انہیں چار پولیس والے دکھائی دیئے جن میں سے ایک پولیس والا ہاتھ کے اشارے سے قاسم کو کار روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر قاسم کا رنگ فق ہو گیا۔

''اوہ! اب کیا کروں؟'' قاسم نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''کار روک دو ورنہ چالان ہو جائے گا۔'' یونس نے کہا تو قاسم نے کار پولیس والوں کے قریب ایک سائیڈ پر روک دی۔ علی نے

بھی اپنی کار اس کی کار کے پیچھے روک دی تھی۔ پھر وہ سب دوست کاروں سے باہر نکل آئے۔ پولیس والے نے کار کی نمبر پلیٹ چیک کی، پھر وہ ان کے پاس آ گیا۔

''یہ کار کس کی ہے؟''

''یہ کار میری ہے۔'' قاسم نے جواب دیا۔

''تھوڑی دیر پہلے پل پر ایک موٹر سائیکل والے کو تم نے کار کی سائیڈ ماری تھی؟'' پولیس والے نے پوچھا تو قاسم کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات اُبھر آئے، تاہم اس نے خود پر قابو پا لیا۔

''جج...... جی...... نن...... نہیں۔''

''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک شہری نے فون کر کے تمہاری کار کا نمبر لکھوایا ہے۔ تھانے چلو باقی تفتیش وہیں ہوگی۔'' پولیس والے نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''مگر......''

''ظہیر! تم اس کی کار میں بیٹھ کر اس کے ساتھ تھانے پہنچو۔ میں آ رہا ہوں۔'' پولیس والے نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یس سر۔'' ظہیر نامی پولیس والے نے جواب دیا، پھر وہ اس نے قاسم کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سائیڈ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قاسم کے دوست بھی کار میں بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب تھانے میں موجود تھے۔ قاسم بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ نجانے اب اس کے ساتھ کیا ہو۔ اگر اس کے ابو کو پتا چل گیا تو وہ اس پر بے حد ناراض ہوں گے۔

''حبیب! ان لڑکوں کو کیوں پکڑ لائے ہو؟'' ایس ایچ او نے پولیس والے سے پوچھا۔

''سر! ایک شہری نے کال کی تھی کہ ایک کار نے تیز رفتاری سے ایک موٹر سائیکل کو جس پر ایک مرد اور ایک بچہ سوار تھے، ٹکر مار دی ہے اور کار والا جائے حادثہ پر رُکنے کی بجائے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس شہری نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا جس کی وجہ سے ہم نے شہر کی ناکہ بندی کرا دی تھی۔ پھر جیسے ہی مطلوبہ کار چوک پر پہنچی تو ہم نے اسے ٹریس کر کے یہاں لے آئے ہیں۔'' پولیس والے نے تفصیل سے بتایا تو ایس ایچ او، قاسم اور اس کے دوستوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''موٹر سائیکل سواروں کی حالت کیسی ہے؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''سر! وہ معمولی زخمی ہیں، اس لئے وہ خطرے سے باہر ہیں۔'' پولیس والے نے کہا تو ایس ایچ او نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم میں سے کار کون چلا رہا تھا؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''میں چلا رہا تھا۔'' قاسم نے جواب دیا۔

''کار چلانے کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟'' ایس ایچ او کا انداز تفتیشی تھا۔

''نہیں...... ابھی میرا لائسنس نہیں بنا۔''

''تمہاری عمر کیا ہے؟''

''ساڑھے سترہ سال۔''

''جب تم نے موٹر سائیکل سواروں کو سائیڈ ماری تھی، تم اکیلے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''میں اکیلا تھا۔''

''ہونہہ.....'' ایس ایچ او نے ہنکارہ بھرا۔ ''تمہاری عمر ساڑھے سترہ سال ہے، اس لئے ابھی تمہارا لائسنس نہیں بن سکا۔ اس کے باوجود تم کار چلا رہے تھے، حالانکہ اٹھارہ سال سے کم عمر افراد کا موٹر سائیکل اور کار چلانا جرم ہے۔''

قاسم خاموش کھڑا رہا، اس کا سر شرمندگی اور خوف سے جھکا ہوا تھا۔

''تمہارے والد کا نام کیا ہے۔ ان کا سیل نمبر بھی بتاؤ۔'' ایس ایچ او نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو قاسم نے اپنے ابو کا نام اور ان کا سیل نمبر بتا دیا۔ ایس ایچ او نے قاسم کے ابو خلیق احمد سے سیل فون سے بات کی اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں فوراً تھانے پہنچنے کی ہدایت کی۔ پھر انہوں نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قاسم کے ابو خلیق احمد تھانے پہنچ گئے۔ وہ بھی بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ حادثہ کیسے ہوا ہے؟'' خلیق احمد نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

''حادثہ تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ایس ایچ او نے بتایا۔

''آپ کا بیٹا رش میں تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا جا رہا تھا مگر اس میں اس بچے کا کوئی قصور نہیں ہے، قصور آپ کا ہے۔''

''میرا قصور؟'' خلیق احمد پریشان ہو گئے۔

''بالکل آپ کا قصور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے بچے کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہے مگر آپ نے اپنے بچے کو کار سڑک پر چلانے کی اجازت دے دی۔ چاہے آپ کا بچہ کار ٹھیک طریقے سے چلا سکتا ہو یا نہیں۔ دوسری بات ابھی آپ کے بچے کا لائسنس بھی نہیں بنا۔ اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کا موٹر سائیکل اور کار چلانا قانوناً جرم ہے۔ پھر جب نوجوان نسل کار چلاتے ہیں تو وہ یہ خیال ہی نہیں کرتے کہ ان کی تیز رفتار کار چلانے سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نوجوان لڑکے تو بس ہواؤں میں اُڑنا چاہتے ہیں۔'' ایس ایچ او نے لمبی تقریر کر دی۔ خلیق احمد، ان کا بیٹا قاسم اور قاسم کے دوست سب شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔

''ایس ایچ او صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سارا قصور میرا ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو اٹھارہ سال کا ہونے سے پہلے ہی کار چلانے کی اجازت دے دی تھی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میرا بیٹا اٹھارہ سال کا نہیں ہو جاتا، کار چلانے کے لئے اس کا لائسنس نہیں بن جاتا، میں اسے کار چلانے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' خلیق احمد نے کہا۔

''بہت اچھی بات ہے۔'' ایس ایچ او نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے بچے کو آپ کی ضمانت پر چھوڑ رہا ہوں لیکن میں ان سے اپیل کرتا ہوں کہ خدارا، گاڑی مناسب رفتار سے چلایا کریں اور دوسروں کا بھی خیال رکھا کریں۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ تم کیا کہتے ہو قاسم؟'' آخری بات انہوں نے قاسم سے پوچھی تھی۔

''سر! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ میں جب تک اٹھارہ سال کا نہیں ہو جاتا اور میرا لائسنس نہیں بن جاتا، میں کار نہیں چلاؤں گا۔ جب بھی کار چلاؤں گا تو مناسب رفتار سے چلاؤں گا تاکہ میری وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان نہ ہو۔''

ایس ایچ او نے قاسم کے چہرے پر نئے عزم کے تاثرات دیکھے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

(بقیہ: آپ بھی لکھیے) میں گزارتا اور اپنی جیب خرچ سے اس کی دوائی وغیرہ لاتا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میرا شاگرد یہ عظیم کام سرانجام دے رہا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔'' ''استاد صاحب، ایسا طالب علم اُستاد کے لیے باعث فخر ہے مگر اس سے شہزاد کا کیا تعلق؟'' احمد صاحب نے جواب دیا۔ ''کیا مطلب؟ کھل کر بتائیے۔'' ''احمد صاحب، وہ طالب علم شہزاد ہی ہے۔'' ''بہت خوب! آفرین ہے شہزاد، شاباش!'' احمد صاحب نے آگے بڑھ کر شہزاد کو سینے سے لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔ ''بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔ اگر تم مجھے بتا دیتے شاید میں بھی تمہارے ساتھ اس بزرگ کی بہتر طریقے سے تیمار داری کر سکتا۔'' اصل میں وہ بوڑھا آدمی احمد صاحب کے ابا جان تھے جو 14 اگست 1947ء کو ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے۔ ہندوؤں کے ایک حملے میں ان کے والد صاحب بچھڑ گئے تھے۔ راستے میں والدہ کا انتقال ہو گیا، خدا کی قدرت کہ آج اچانک ان سے ملاقات ہو گئی۔ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب) ☆☆☆

دوستی کا حق

(حفصہ فیصل، کراچی)

"بنٹی، آج پھل کچے کیوں لائے ہو؟" ٹشی بولا۔

"ابھی بہار کا موسم شروع ہوا ہے، بہت سے پھل کچے ہیں۔ یہ بھی بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔" بنٹی بولا۔

بنٹی، چنٹی، بشی اور ٹشی چار بونے تھے۔ جنگل میں ایک لکڑیوں سے جھونپڑی بنی تھی جو ان کا پیارا گھر تھا۔ چاروں نے کام بانٹے ہوئے تھے۔ روزانہ صبح سویرے چاروں اپنے اپنے بستر جھاڑ کر صاف کرتے اور پھر نکل جاتے۔ بشی لکڑیاں چن کر لاتا، چنٹی اناج کے دانے لاتا، بنٹی پھل توڑ کر لاتا اور ٹشی پانی کا گھڑا بھر لاتا۔ دن چڑھے چاروں لوٹتے۔ بنٹی بڑے سے پیالے میں پھل ڈال کر پانی کے گھڑے کے نیچے رکھتا تاکہ پھل ٹھنڈے ہو جائیں۔ بشی لکڑیاں جلاتا، چنٹی اناج کو صاف کر کے پتیلے میں ڈالتا، اس میں پانی ملاتا اور چولہے پر چڑھا دیتا۔ کچھ ہی دیر میں کھانا بن جاتا۔ گڑھے کا ٹھنڈا پانی پی کر چاروں کھانا شروع کرتے، پھر پھل کھاتے اور رب کا شکر ادا کرتے۔ چاروں میں بہت اتفاق تھا، کبھی لڑتے نہیں تھے۔

ایک دن جب وہ صبح سویرے بیدار ہوئے تو ٹشی چکرا کر گر پڑا۔ تینوں اس کی طرف دوڑے۔

"ارے! ٹشی کو تو بخار ہے۔" بنٹی بولا۔ "بشی! تم ڈاکٹر بھالو سے دوا لے آؤ جلدی سے......" چنٹی بولا۔ "ٹشی دوا کھا لو اور آرام کرو۔ ہم کام پر جا رہے ہیں۔" "مگر پانی؟"

"تم فکر نہ کرو ٹشی......ہم آ کر کچھ کرتے ہیں۔"

پھر انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ تینوں میں سے جس کا کام پہلے ہو جائے گا، وہ آ کر گڑھا لے جائے گا اور پانی بھر لائے گا۔"

"ارے، میں سب سے پہلے آ گیا۔" بشی بڑبڑایا۔ آج بشی کو لکڑیاں قریب سے مل گئی تھیں اور اس طرح وہ جلد گھر لوٹ آیا۔

"ارے واہ! بشی تم تو پانی بھی بھر لائے، تم نے آج دو کام کر لیے۔" بنٹی اور چنٹی، بشی کی تعریف کر رہے تھے۔ آج دو دن ہو چکے تھے، ٹشی کی طبیعت ٹھیک ہی نہیں ہو رہی تھی۔ تینوں دوست سر جوڑے بیٹھے تھے کہ کسی طرح اپنے دوست کو تن درست کیا جا سکے، مگر کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔ اسی اداسی میں رات ہو گئی اور سب سو گئے۔

بنٹی پھل توڑ رہا تھا کہ اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد بنٹی نے ایک باریش بزرگ کو اپنے سامنے پایا۔

"ارے! بونے میاں، آپ اس ٹوکری میں کیا بھر رہے ہیں؟" بزرگ نے مسکراتے ہوئے بنٹی سے پوچھا۔

"وہ، وہ میں پھل جمع کر رہا ہوں۔" بنٹی نے گھبرا کر جواب دیا۔

"اتنے سارے پھل آپ خود کھائیں گے؟" بزرگ نے کہا۔

"نہیں، وہ میں اور میرے دوست مل کر کھائیں گے۔" بنٹی نے اب اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اچھا! کہاں ہیں آپ کے دوست؟"

پھر بنٹی نے اپنے دوستوں، گھر اور کاموں کے بارے میں بزرگ کو بتایا۔ بنٹی کو اس نیک انسان سے باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا مگر جب ٹشی کا ذکر آیا تو بنٹی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بنٹی! رومت، میں ایک حکیم بھی ہوں۔ چلو مجھے اپنے دوست سے ملواؤ، میں اس کے لیے کوئی جڑی بوٹی تجویز کرتا ہوں۔" بزرگ نے بتایا۔ بزرگ کی بات سن کر بنٹی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"ٹشی، ٹشی...... میرے یار، میرے دوست، آنکھیں کھولو...... دیکھو تو میں کس کو ساتھ لایا ہوں؟" بنٹی نے ٹشی کی آواز پر آنکھیں کھولیں، چہرے پر کمزوری اور آنکھوں میں زردی چھائی تھی۔

"ارے! اسے تو یرقان کا بخار لگتا ہے۔ تم ٹشی گھنے جنگلوں میں جا سکتے ہو؟" حکیم صاحب نے پُرفکر لہجے میں کہا۔

"جی، جی، کیوں نہیں...... میں اپنے دوست کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"ہم م م...... ایسا کرو...... گھنے جنگل کے وسط میں ایک جڑی بوٹی "پرشاوشا" پائی جاتی ہے، بس وہی تمہارے دوست کا علاج ہے۔"

اتنی دیر میں بشی اور چنٹی بھی کام نمٹا کر پہنچ چکے تھے۔ "میں یہ کام ضرور کروں گا۔" بنٹی پُرعزم لہجے میں بولا۔ "نہیں، بنٹی......

یہ کام میں کروں گا۔" بشی بولا۔

"نہیں بشی! میں پھلوں کی تلاش میں کئی دفعہ گھنے جنگل کے پاس تک گیا ہوں، اس لیے یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔" بنٹی نے بشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس طرح بنٹی، اللہ کا نام لے کر روانہ ہوا۔ گھنے جنگل میں درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے، جس کے باعث دن میں بھی وہاں رات کا گمان ہوتا تھا۔ بنٹی سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا کیوں کہ گھنے جنگل میں سانپ اور بچھو بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے لو لگائے ہوئے تھا۔ آخر کار نصرتِ خداوندی آئی اور وہ اس جڑی بوٹی تک پہنچ ہی گیا۔

"بنٹی میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں، تم نے واقعی دوستی کا حق نبھایا ہے۔" بشی نے تشکر سے کہا۔

"نہیں دوست! ایسے مت کہو، تم میرے دوست ہی نہیں، بھائی بھی ہو اور یہ میرا فرض تھا۔"

آج جنگل کے اس ننھے منے گھر میں دعوت تھی جس میں حکیم صاحب کے علاوہ بشی، بھٹی، چاٹی اور بنٹی کے دوست نیلی چڑیا، گوگو مرغا، کالو کتا اور بگو چوہا بھی مدعو تھے اور سب بشی کے لیے جشنِ صحت میں تحفہ لائے تھے جسے بشی پُرنم آنکھوں سے وصول کر رہا تھا۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

جیسے کو تیسا

(ماہوش طالب)

"عمر بیٹا! ٹی وی بند کر دو، یہ ہوم ورک کرنے کا وقت ہے، پہلے اسکول کا کام مکمل کر لو۔" امی، دادی جان کی ذمہ داری پر بچوں کو چھوڑ کر سردیوں کے لیے خریداری کرنے گئی تھیں اور عمر جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت شرارتی لڑکا بھی تھا، اپنی امی کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر دادی جان کے تو بالکل ہاتھ نہیں آتا تھا۔ "اوہو! دادی جان، آہستہ بولیں، آپ کی آواز سے تو ٹی وی کی آواز ہی دب گئی ہے۔" وہ لحاظ کیے بغیر گویا ہوا۔ "ہاں بھئی، آج کل کے بچوں کے لیے تو یہ بے ہودہ کارٹونز زیادہ اہم ہیں، باقی سب جہاں مرضی جائیں۔" دادی نے اس کی بدتمیزی کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ "جب میری امی آئیں گی تو میں کر لوں گا اسکول کا کام، آپ فکر نہ کریں۔" عمر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔ جب امی رات کو بازار سے واپس آئیں تو عمر نے ڈھیر ساری ڈانٹ کھانے کے ساتھ ہوم ورک مکمل کیا۔

یہ کچھ ہی دنوں بعد کی بات تھی۔ عمر دُکان سے چپس کا پیکٹ خریدنے کے بعد واپس گھر آ رہا تھا، گلی کے نکڑ میں داخل ہوتے ہی ایک بال پورے زور سے اس کی دائیں ٹانگ پر لگی۔ درد سے کراہتے ہوئے وہ بے اختیار ہوا اور چپس کا پیکٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا، جس سے سارے چپس فرش پر بکھر گئے۔ ایک تو درد اوپر سے چپس ضائع ہونے کا دکھ، وہ غصے سے پلٹا اور اس بچے کی جانب بڑھا، جس کی شاٹ کا وہ نشانہ بنا تھا۔ "تمہیں تمیز نہیں ہے کھیلنے کی؟" وہ بچہ جس کا نام رافع تھا، عمر کا پڑوسی تھا اور عمر سے ایج میں چھوٹا بھی۔ "آرام سے بات کرو، تمیز تو مجھے تم سے زیادہ ہی ہے، دیکھ نہیں رہے ہم کھیل رہے ہیں۔" رافع بھی عمر کی طرح ہی بدلحاظ تھا، اس لیے ڈرے بغیر بولا۔ "ہاں ہاں، مجھے نظر آ رہا ہے کہ تمہیں کتنی تمیز ہے، بڑوں کی عزت تو تمہیں کرنی آتی نہیں، آئے بڑے۔" عمر نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر اس کی نقل اُتاری۔ "تم تو جیسے بہت کہنا مانتے ہو ناں اپنے بڑوں کا، اپنی دادی سے جب تم بدزبانی کرتے ہو تو آواز ہمارے گھر تک آتی ہے۔" رافع کی یہ بات سن کر گلی میں کھڑے باقی بچے بھی ہنسنے لگے، تو خفت سے عمر کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گیا۔ "اس کو کیسے پتا کہ میں اپنی دادی کی بات نہیں مانتا۔" عمر سوچتا ہی رہ گیا اور بعد میں شرمندگی کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ رافع نے تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر ہوا میں تیر پھینکا تھا۔ جھوٹ بولنا رافع کی عادت تھی مگر عمر واقعی ہی حیران و پریشان ہوتا رہا کہ اس طرح تو سب محلے کے بچوں کو پتا لگ گیا ہو گا اور بدلے میں کوئی بھی اس کی عزت نہیں کرے گا۔ اسے اچانک ہی اپنی نادانیوں کا احساس ہوا کہ جس طرح اسے رافع کے بدتمیزی کرنے سے اتنی تکلیف ہوئی، اسی طرح دادی اور امی کو بھی کتنا بُرا لگتا ہو گا جب وہ ان کی بات نہیں مانتا، حالاں کہ وہ دونوں تو اس کی بھلائی کی وجہ سے ہی اسے منع کرتی ہیں۔ اگلی صبح اسکول جانے سے پہلے عمر نے اپنی دادی اور امی سے معافی مانگی۔ وہ دونوں اسی وقت اس پر نہال ہو گئیں کہ عمر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، فوراً اسے پیار سے گلے لگا لیا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

غلطی

(یمنہ کاشف، بہاول پور)

آمنہ ایک بہت ہی ذہین بچی تھی، ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آنے والی۔ آمنہ جب ساتویں جماعت میں آئی تو اس کی کلاس میں ایک نئی لڑکی آئی جس کا نام فائزہ تھا۔ فائزہ بہت ہی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور بہت خوب صورت بھی تھی، اسی وجہ سے تمام

لڑکیاں اس کی دوست بننا چاہتی تھیں۔ آمنہ بھی اس کی دوست بننا چاہتی تھی مگر فائزہ کی شخصیت آمنہ سے مختلف تھی۔ فائزہ کو پڑھنے لکھنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ جب ان کے امتحانات ہوئے تو آمنہ اور فائزہ آگے پیچھے بیٹھی تھیں۔ آمنہ نے فائزہ کو اپنا پرچہ دکھایا۔ فائزہ بالکل پڑھ کر نہیں آئی تھی لیکن پھر بھی اس کا پرچہ آمنہ کی وجہ سے بہت اچھا ہو گیا۔ پھر اسی طرح ہونے لگا۔ آمنہ ہمیشہ فائزہ کو اپنا پرچہ نقل کرواتی، اس طرح دونوں بہترین دوست بن گئیں۔ فائزہ، آمنہ کی دعوتیں کرتی اور آمنہ بہت خوش تھی کہ فائزہ جیسی لڑکی اس کی دوست بن گئی ہے۔ کالج اور یونیورسٹی میں بھی دونوں ساتھ ساتھ رہیں اور فائزہ ہمیشہ آمنہ کا پرچہ نقل کر کے پاس ہوتی رہی۔ آخر کار اسی طرح دونوں نے اُردو میں ایم فل کر لیا۔ اس کے بعد فائزہ نے ایک اسکول میں جاب کر لی اور آمنہ کی بھی شادی ہو گئی۔

ایک دن آمنہ کا بڑا بیٹا اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ ''امی قمیص کون سے ''کاف'' سے لکھتے ہیں۔'' آمنہ نے اسے بتایا۔ ''بیٹا قمیص نقطوں والے ''کاف'' سے لکھتے ہیں۔'' یہ سن کر بیٹا ماں سے کہنے لگا کہ امی میں نے بھی ٹیچر سے یہی کہا تھا لیکن ٹیچر نے میری بات مانی ہی نہیں۔ یہ سن کر آمنہ پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنے بیٹے سے اُردو کی کاپی منگوائی تو اس میں ڈھیروں غلطیاں تھیں جنھیں ان کی ٹیچر نے ٹھیک کرنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ آمنہ کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ اگلے دن وہ اپنے بیٹے کے اسکول پہنچ گئی اور میڈم سے ٹیچر کی شکایت کر دی۔ میڈم نے کہا کہ ان کی ٹیچر نے تو ایم فل کیا ہوا ہے، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اتنے میں اس کے بیٹے کی ٹیچر بھی آ گئیں۔ آمنہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی، وہ اس کی سہیلی فائزہ تھی۔ فائزہ بڑے اچھے انداز میں آمنہ سے ملی۔ آمنہ بالکل چپ شرمندہ سی کھڑی تھی کیوں کہ وہ جان گئی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی غلطی تھی۔ آمنہ نے سوچا کہ وہ اپنے بیٹے کو تو اس اسکول سے ہٹا لے گی لیکن باقی جتنے بھی بچے اس سے پڑھیں گے، ان کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اسے اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہو رہا تھا لیکن اب کوئی فائدہ نہ تھا۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

حیدر اور کشتی

(دانش تسلیم، سیال کوٹ)

سمندر کے قریب ایک گھر میں ایک یتیم بچہ حیدر اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کی والدہ ایک گھر میں ملازمہ تھی اور اپنے بیٹے کی ہر جائز خواہش پوری کرتی تھیں۔ اس کا والد ایک مچھیرا تھا۔ آج سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ اس کا والد مچھلیاں پکڑنے گیا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کشتی میں سوراخ ہے۔ سوراخ کے باعث کشتی میں پانی جمع ہو گیا اور کشتی ڈوب گئی اور اس کا انتقال ہو گیا جس کا صدمہ حیدر کی والدہ کو آج بھی ہے اور وہ اس واقع سے بہت ڈر چکی ہیں۔

ایک بار حیدر کی والدہ کی مالکن گھر پر آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ میز پر ایک خوب صورت کشتی رکھی ہے۔ مالکن کو یہ کشتی بہت پسند آئی، اس نے جھٹ سے پوچھا۔ ''یہ کشتی کہاں سے خریدی ہے؟'' حیدر کی والدہ نے کہا۔ ''یہ میرے بیٹے حیدر نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔'' حیدر پاس ہی کھڑا تھا۔ مالکن خوش ہوئیں اور حیدر کو شاباش دی۔ حیدر کا ایک دوست تھا جس کا نام انور تھا، یہ اس کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے راز دان تھے۔

حیدر کو مچھلیاں پکڑنے اور کشتی چلانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ایک دن اپنی امی جان سے خواہش کی کہ وہ کشتی چلانے کے لیے جانا چاہتا ہے۔ امی نے غصے سے کہا۔ ''کہیں نہیں جاؤ گے تم۔''

''امی جان! مگر کیوں نہیں جا سکتا؟'' حیدر نے معصومانہ شکل بناتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ابا جان کی وفات بھی ایسے ہی ہوئی تھی۔ اب میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی۔''

''امی جان! میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں، مگر صرف ایک بار جانے دیں۔ یقین کریں، میں بہت احتیاط کروں گا اور بہت سی مچھلیاں بھی پکڑ کر لاؤں گا، پھر دونوں مل کر کھائیں گے۔'' حیدر نے امی جان کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا!......''

''امی، آپ بس میرے لیے دعا کریں۔''

حیدر کی ضد کی وجہ سے اس کی والدہ نے اس کی بات تو مان لی، مگر وہ اب بھی بہت پریشان تھیں، حیدر کو رخصت کر دیا۔ حیدر نے کشتی سمندر میں اتاری اور کشتی چلاتا چلاتا بہت آگے تک جا نکلا اور سکون سے مچھلیاں پکڑنے لگا۔ اس نے بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی جو کہ سمندری طوفان میں تبدیل ہو گئی۔ حیدر کی کشتی بہت دُور جا چکی تھی اور تمام مچھلیاں پانی میں جا گریں۔ تیز بارش اور ہوا کے باعث حیدر کے ہاتھ سے چپو پھسل کر پانی میں ڈوب گیا۔ سمندر کے قریب سے

تمام لوگ گھروں کو روانہ ہو گئے۔

دوسری جانب اس کی ماں گھر میں جائے نماز پر بیٹھی اپنے بیٹے کی حفاظت کی دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ صحیح سلامت گھر لوٹ آئے۔

حیدر سمندر کے بیچ و بیچ چلا جا رہا تھا۔ "بچاؤ! بچاؤ! مجھے کوئی بچائے۔" اب سمندر بھی بالکل ویران ہو چکا تھا۔ اسے اپنی امی کی باتیں یاد آ رہی تھیں، اس لیے وہ بہت شرمندہ تھا اور یہی سوچتا جا رہا تھا کہ کاش ان کی بات مان لیتا۔ آہستہ آہستہ بارش ختم ہوئی اور حیدر ایک چپو کی مدد سے سمندر کے کنارے پر پہنچ گیا، کنارے پر پہنچ کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ماں گھر پر حیدر کا انتظار کر رہی تھی۔ جب صبر جواب دے گیا تو اس نے حیدر کے دوست انور کو ساتھ لیا اور دونوں سمندر کی طرف چل دیئے۔ جب کنارے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ حیدر بے ہوش پڑا تھا۔ انور اور حیدر کی ماں نے حیدر کو کنارے سے اُٹھایا اور اسے گھر لے آئے۔ جب اسے ہوش آیا تو ماں نے اپنے لختِ جگر کو سینے سے لگا لیا اور دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔

"امی جان! مجھے معاف کر دیجیے، میں نے آپ کا کہنا نہیں مانا۔" حیدر نے روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔ حیدر نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی بھی آپ کی کوئی بات نہیں ٹالے گا۔" دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور شکرانے کے دو نوافل بھی ادا کیے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

نیکی

(حافظ اقصیٰ ضیاء، سرگودھا)

احمد صاحب اور ان کی بیگم کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے بیگم احمد کہہ رہی تھیں کہ کافی دنوں سے شہزاد اسکول سے لیٹ گھر آتا ہے۔ پہلے تو وہ اپنے دوسرے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ وقت پر پہنچ جاتا تھا لیکن مجھے اس کی دیر سے گھر آنے کی حرکت بالکل پسند نہیں ہے۔ "بیگم دیکھو، ان چھوٹی باتوں پر ایسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ شہزاد اب ماشاء اللہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے، وہ کافی سمجھ دار ہے۔ اچھے اور بُرے کی تمیز کرنا جانتا ہے، بچوں کو ہر وقت ڈانٹتے رہنا اچھی بات نہیں۔" احمد صاحب نے بیٹے کی حمایت کی۔ یہ سن کر بیگم احمد نے غصے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں تو اپنے بیٹے کا ہمیشہ بُرا ہی سوچتی ہوں۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ آپ کے لاڈ پیار نے اسے اگر ابھی تک نہیں بگاڑا تو اب ضرور بگاڑ دے گا۔ لاڈ پیار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، میں بھی آخر اس کی ماں ہوں۔ اگر ہم اس کے بارے میں فکرمند نہ ہوں تو پھر کون ہو گا؟ میں مانتی ہوں شہزاد ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی عادات و اطوار پر نظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے کیوں کہ یہ بھی ہمارا فرض ہے۔" "اچھا جی!" احمد صاحب نے اپنی بیگم کی باتیں سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی بات کو تسلیم کرتا ہوں، ابھی جا کر اس کے اُستاد صاحب سے اس کے بارے میں شکایت کرتا ہوں، شہزاد کے کلاس ٹیچر اپنی گلی کے موڑ پر ہی تو رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ اگلے دن احمد صاحب کمرے میں اضطرابی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی بیگم صوفے پر بیٹھی خاموشی سے کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ احمد صاحب نے دیوار پر لگے وال کلاک کی طرف دیکھا، چلتے چلتے رُک گئے اور کہنے لگے۔ "ڈھائی بج چکے ہیں، ابھی تک شہزاد کے ماسٹر صاحب نہیں پہنچے۔" بیگم صاحبہ نے بھی کلاک کی طرف نظر ڈالی اور بولیں۔ "جی ہاں! وقت تو ہو چکا ہے، ویسے آپ کی شہزاد کے اُستاد صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی نا......" اچانک گھر کی گھنٹی بج اُٹھتی ہے۔ "معلوم ہوتا ہے اُستاد صاحب آ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر احمد صاحب باہر گیٹ کی طرف لپکے، دروازہ کھولا تو اُستاد صاحب اور شہزاد کھڑے تھے۔ اُستاد صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا اور انہیں چائے وغیرہ پیش کی گئی۔ "اُستاد صاحب! آپ کے سپرد ایک کام کیا گیا تھا، اس کا کیا بنا؟" احمد صاحب نے اُستاد صاحب سے گفتگو شروع کی۔ اُستاد صاحب نے ایک نظر مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا اور مخاطب ہوئے۔ سب سے پہلے میں آپ کو تمہید کے طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ "ہمارے اسکول کے باہر ایک بوڑھا آدمی بچوں کے لیے ٹافیاں فروخت کرتا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی بچوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ایک دن اچانک وہ غائب ہو گیا اور کئی دنوں تک اسکول کا رُخ نہ کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ٹافیاں بیچنے لگا۔ بوڑھے آدمی کی غیر موجودگی کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ میری جماعت میں ایک طالب علم تھا جس نے بوڑھے آدمی کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر وہ بوڑھے آدمی کے گھر تک جا پہنچا۔ بوڑھا آدمی شدید بیمار تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ تنہا ایک کچے مکان میں رہتا تھا۔ اس طالب علم نے اس کی تیمارداری شروع کر دی۔ اس کو جتنا وقت ملتا وہ بوڑھے آدمی کی خدمت (بقیہ: صفحہ نمبر 46 پر)

ڈھانچے نے اپنا بازو کیٹی کی گردن میں ڈالا اور بولا۔

"اب تم قیامت تک میرے ساتھ اسی تابوت میں رہوگی۔"

کیٹی کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ ڈھانچے نے اپنے ہاتھ کی ہڈیاں کیٹی کے منہ پر رکھ دیں اور کیٹی بے ہوش ہوگئی۔

اب ہم واپس تھیوسانگ کی طرف چلتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ شہزادی کے ایک دم بگولے کے ساتھ اُڑنے کے بعد عنبرناگ ماریا تو آج کے زمانے میں شہر لاہور میں جا اُترے تھے اور اس وقت لاہور کے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل کے ایک کمرے میں رہ رہے ہیں اور انہیں کیٹی، جولی سانگ اور تھیوسانگ کا انتظار ہے کہ شاید وہ بھی اس شہر میں آنکلیں جب کہ جولی سانگ شہر بابل کے شمال میں پانڈو نجومی کے ساتھ ایک شان دار محل میں اس کی بیوی بن کر رہ رہی ہے۔ جولی سانگ اپنی یادداشت کھو چکی ہے، اسے یاد ہی نہیں کہ وہ جولی سانگ ہے اور عنبرناگ ماریا کی ساتھی ہے اور تھیوسانگ کی بہن ہے۔

تھیوسانگ اسی شہر بابل کی سرائے میں کیٹی کے ساتھ اُترا تھا کہ جولی سانگ کو وہاں تلاش کرے۔ کیٹی کو نئی طاقت مل چکی ہے۔ وہ جولی سانگ کی طرح نہ صرف یہ کہ مُردوں سے بات کر سکتی ہے بلکہ ان کے ساتھ مُردوں کی دُنیا کی سیر بھی کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایک نئی مصیبت میں پھنس چکی ہے۔ جب دن نکلا تو تھیوسانگ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اس نے دیکھا کہ کیٹی کی کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دو تین بار دستک دینے پر بھی جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو تھیوسانگ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ کیٹی وہاں نہیں تھی۔ تھیوسانگ نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کیٹی سرائے سے باہر گئی ہو۔ وہ کوٹھڑی کے آگے چارپائی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس نے فضا میں گہرا سانس کھینچا تو ایک دم سے چونک پڑا۔ فضا میں کیٹی کی خوشبو نہیں تھی۔

"کیٹی کو کیا ہوگیا؟ کہیں اس کے ساتھ کوئی خطرناک حادثہ تو نہیں ہوا؟" تھیوسانگ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کوٹھڑی میں غور سے دیکھا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ کیٹی بستر پر سے اُٹھ کر ابھی ابھی گئی ہے۔ اچانک تھیوسانگ کو خیال آگیا کہ وہ کہیں مُردہ عورت لوشیا کے ساتھ مُردوں کی دُنیا میں تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوچتے ہی تھیوسانگ قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ لوشیا کی قبر کہاں پر ہے۔ لوشیا کی قبر کے سرہانے کی طرف پتھر ذرا ہٹایا اور جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوا کہ قبر خالی تھی اور اس میں لوشیا کی لاش کفن میں لپٹی پڑی تھی۔ تھیوسانگ کو تعجب ہوا کہ اگر لوشیا کی لاش قبر میں ہی ہے تو پھر کیٹی کس کے ساتھ مُردوں کی دُنیا میں سیر کرنے گئی ہے؟

تھیو سانگ لوشیا کی لاش سے بات چیت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بڑا پریشان ہوا۔ کیا کروں؟ کیٹی کو کہاں تلاش کروں؟ اس نے یونہی لوشیا کی لاش سے پوچھا۔

''لوشیا! اگر تم بول سکتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ کیٹی کہاں ہے؟''

لوشیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو ایک مُردہ لاش تھی اور تھیو سانگ کے پاس مُردہ لاش سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ تھیو سانگ مایوس ہو کر قبرستان سے باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے اور کیٹی کو کہاں تلاش کرے۔ پہلے جولی سانگ گم ہوئی اور اب کیٹی بھی غائب ہو گئی تھی۔ واپس سرائے میں آ کر تھیو سانگ نے اس چوکیدار سے پوچھا جو رات کو پہرہ دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے کسی عورت کو رات کے وقت سرائے سے باہر جاتے نہیں دیکھا۔ تھیو سانگ کا سرائے میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ دوپہر تک شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھرتا رہا۔ اسے کہیں کسی جگہ بھی جولی سانگ اور کیٹی کا سراغ نہ ملا۔ اب وہ شہر کے شمال کی طرف آ گیا جہاں دریا بہتا تھا۔ دریا کے کنارے کنارے وہ اس محل کے پاس آ کر رُک گیا جو نجومی پانڈو نے خریدا تھا اور جہاں جولی سانگ اس کی بیوی بن کر رہ رہی تھی۔

تھیو سانگ محل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے دریا میں ایک خوب صورت کشتی نظر آئی۔ کشتی میں ایک عورت اور مرد بیٹھے تھے۔ کشتی ذرا قریب آئی تو تھیو سانگ اپنی جگہ پر خوشی سے اُچھل پڑا۔ کشتی میں جولی سانگ خوب صورت ریشمی لباس پہنے بیٹھی تھی اپنے ساتھ والے کالے کلوٹے مرد سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ تھیو سانگ بھاگ کر کشتی کے پاس گیا۔ کشتی کنارے کے ساتھ لگ رہی تھی۔ تھیو سانگ نے جولی سانگ کی طرف دیکھ کر آواز دی۔ ''جولی سانگ!''

جولی سانگ نے حیرانی سے تھیو سانگ کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھی مرد یعنی نجومی پانڈو سے کہا۔ ''یہ کون یہاں آ گیا ہے؟ یہ کیا نام لے رہا ہے؟''

پانڈو نجومی فوراً سمجھ گیا کہ یہ آدمی جولی سانگ کا ساتھی تھیو سانگ ہی ہو سکتا ہے۔ تھیو سانگ بولا۔ ''جولی سانگ! میں تھیو سانگ ہوں، تمہارا بھائی۔''

جولی سانگ نے کہا۔ ''نہ میرا نام جولی سانگ ہے اور نہ کوئی میرا بھائی تھیو سانگ نام کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم ضرور کوئی پاگل ہو۔'' تب نجومی پانڈو نے تھیو سانگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ میری بیوی ہے، اس کا نام جولی سانگ نہیں بلکہ شانتی ہے۔ اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں تو مجھے اپنے نوکروں کو آواز دینی پڑے گی۔''

تھیو سانگ سمجھ گیا تھا کہ کسی طلسم کی وجہ سے جولی سانگ کی یادداشت گم کر دی گئی ہے اور یہ کام اسی کالے کلوٹے بدمعاش نے کیا ہے۔ وہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تھیو سانگ وہاں سے واپس آ گیا مگر دل میں اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سرائے میں آ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی اور چاروں طرف بابل شہر میں اندھیرا چھا گیا تو تھیو سانگ سرائے سے نکل کر عیار پانڈو کے دریا والے محل کی طرف چل پڑا۔

محل میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ تھیو سانگ اندھیرے میں محل کے دروازے کی طرف آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ محل کا گیٹ بند ہے اور اس کے باہر ایک چوکیدار پہرہ دے رہا ہے۔ تھیو سانگ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلتا چوکیدار کے پیچھے آ گیا۔ قدموں کی آہٹ کی آواز سن کر چوکیدار نے تھیو سانگ کی طرف دیکھا ہی تھا کہ تھیو سانگ نے اپنی چھوٹی انگلی اس کی گردن سے لگا دی۔ انگلی کے لگتے ہی چوکیدار بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ تھیو سانگ نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا اور محل کے باغ میں سے گزرتا ہوا زینہ چڑھ کر اوپر والے برآمدے میں آ گیا۔ یہاں ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ تھیو سانگ نے کان لگا کر سنا۔ اندر پانڈو نجومی جولی سانگ سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دونوں میاں بیوی کی آوازیں سنائی دیں۔

تھیو سانگ نے منصوبے کے مطابق دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے پانڈو کی کرخت آواز آئی۔

''یہ کون بدتمیز ہے؟''

تھیو سانگ نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ دوسری بار دروازے پر پھر دستک دی اور ایک ستون کے پیچھے ہو کر چھپ گیا۔ دوسری بار دستک دینے پر پانڈو نجومی غصے میں بولتا ہوا دروازے کے پاس آیا اور غرایا۔ ''کون گدھا مجھے رات کے وقت پریشان کر رہا ہے؟''

تھیو سانگ ایک دم سے ستون کے پیچھے سے نکل کر پانڈو نجومی کے سامنے آ گیا اور بولا۔ ''میں ہوں، تھیو سانگ۔ تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔''

تھیو سانگ کو رات کے وقت اپنے محل میں دیکھ کر پانڈو نجومی

ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ وہ نوکروں کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ تھیو سانگ نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی اور اپنی چھوٹی انگلی اس کی گردن سے چپکا دی۔ اس انگلی کے اثر سے پانڈو نجومی وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسے وہیں چھوڑ کر تھیو سانگ کمرے میں گھس گیا۔ جولی سانگ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تھیو سانگ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔ ”تم پھر آ گئے، تم کیا چاہتے ہو؟“

تھیو سانگ نے کہا۔ ”جولی سانگ! تم پر اس شخص نے شدید جادو کر رکھا ہے۔ تم اس کی بیوی نہیں ہو، جولی سانگ ہو۔ میں تمہارا بھائی تھیو سانگ ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لینے آیا ہوں۔“

جولی سانگ کی یادداشت پر تو پانڈو نجومی کے جادو کا شدید اثر تھا، وہ تھیو سانگ کو کیسے پہچان سکتی تھی؟ وہ تو اسے اپنا دشمن سمجھ رہی تھی کہ کوئی ڈاکو ہے جو اسے اغوا کرنے آیا ہے۔ اس نے نوکروں کو آواز دی۔ تھیو سانگ سمجھ گیا کہ اب اسے اپنے دوسرے منصوبے پر ہی عمل کرنا پڑے گا۔

وہ جلدی سے جولی سانگ کے پاس گیا اور اسے دبوچ کر پہلے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ وہ نوکروں کو آواز نہ دے سکے اور پھر اپنی سیدھی انگلی اس کی گردن سے لگا دی۔ جولی سانگ ایک دم سے اس کی انگلی جتنی چھوٹی ہوگئی۔ جولی سانگ نے اپنے آپ کو اتنا چھوٹا ہوتے دیکھا تو دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئی۔ تھیو سانگ یہی چاہتا تھا۔ اس نے جولی سانگ کو اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور تیز تیز چلتا برآمدے میں آیا۔ پھر زینہ اُتر کر باغ میں آ گیا۔ ایک نوکر نے جولی سانگ کی چیخ کی آواز سن لی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا آیا، مگر تھیو سانگ نے اس پر چھلانگ لگا کر اسے قابو کر کے بے ہوش کر دیا۔ سامنے محل کا گیٹ کھلا تھا۔ تھیو سانگ تیزی سے باہر نکل گیا۔ پل پر سے دریا پار کیا۔ اب وہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ قبرستان میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھیو سانگ سیدھا لوشیا کی قبر پر آیا۔ وہ کچھ سوچ کر وہاں آیا تھا۔ اس نے جیب سے انگلی جتنی جولی سانگ کو باہر نکال کر اپنے سامنے قبر کے پاس رکھ دیا۔ جولی سانگ ابھی تک بے ہوش تھی۔

اس کے بعد تھیو سانگ نے قبر کے سرہانے کی طرف سے پتھر ہٹا دیا، نیچے لوشیا کی لاش نظر آنے لگی۔ تھیو سانگ نے جولی سانگ کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔ جب جولی سانگ ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو انگلی جتنی چھوٹی دیکھ کر وہ رونے لگی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ تھیو سانگ نے جولی سانگ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”سنو! اگر تم میری ایک شرط مانو تو میں تمہیں بڑا کر کے تمہارے محل میں واپس چھوڑ آؤں گا۔ میری بات غور سے سنو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

جولی نے پوچھا۔ ”مجھے بتا تیری شرط کیا ہے؟“

تھیو سانگ نے کہا۔ ”تم لاش سے یہ پوچھو کہ کیٹی کہاں ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

جولی نے تعجب سے کہا۔ ”کیا کبھی لاش بھی بول سکتی ہے؟“

تھیو نے کہا۔ ”میں تمہیں جو کہتا ہوں، وہ کرو۔“

جولی قبر میں اُتر گئی۔ اس نے لاش کو ہاتھ لگایا۔ لاش کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر چاروں طرف گہرا عمیق اندھیرا چھا گیا اور یہ سب کچھ ایک عبرت ناک انجام کو جا پہنچا۔ یہ بالکل سچ کہا گیا ہے کہ جو کسی کے لیے کنواں کھودتا ہے، وہ سب سے پہلے خود اس میں گرتا ہے۔ (ختم شد) ☆☆☆

حضرت داوٗد علیہ السلام

خداوند کریم کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دے رکھا تھا کہ جب وہ شہر میں فاتحانہ داخل ہوں تو مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہوں بلکہ خدا کا شکر اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں لیکن لوگوں نے اس حکم کی پرواہ نہ کی اور اکڑ اکڑ کر شہر میں داخل ہوئے۔ اس نافرمانی سے ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ پھر محکوم و مقہور ہو گئے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل میں بہت سے نبی آئے، جن میں حضرت الیاس اور حضرت الیسع کے نام قابل ذکر ہیں لیکن حضرت موسیٰ کی وفات کے کوئی ساڑھے تین سو سال تک ان میں کوئی بادشاہ نہ ہوا۔ اس زمانے میں ایک بادشاہ جالوت نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ بڑا ظالم اور جابر بادشاہ تھا۔ اس نے بنی اسرائیل پر بے پناہ مظالم توڑے۔

اس وقت بنی اسرائیل میں حضرت شموئیل علیہ السلام توریت کے حافظ تھے اور اللہ نے ان کو نبی بھی بنایا تھا۔ چناں چہ قوم نے ان سے درخواست کی کہ ان پر کوئی بادشاہ بنایا جائے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اگر تم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے اور وہ تم کو جہاد کا حکم دے تو تم جہاد سے انکار کر دو۔'' بنی اسرائیلیوں نے کہا۔ ''یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں۔''

چناں چہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت شموئیل نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا لیکن جب بنی اسرائیل نے سنا تو وہ اس پر ناک بھوں چڑھانے لگے اور کہنے لگے۔ ''وہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے۔''

بنی اسرائیل کو تو حیلے بہانے کرنے میں کمال حاصل تھا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر طالوت کا تقرر خدا کی طرف سے ہے تو اس کے لیے خدا کی کوئی نشانی دکھاؤ۔ حضرت شموئیل نے فرمایا کہ تابوت سکینہ جو تم سے چھن گیا ہے، وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس آ جائے گا۔ چناں چہ اللہ کے حکم سے فرشتے تابوت سکینہ طالوت کے پاس لے آئے۔ طالوت بنی اسرائیل کے بادشاہ بنا دیئے گئے۔ اب طالوت نے جالوت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جالوت خود بھی ایک قوی ہیکل انسان تھا اور اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ مجاہدین خدا سے فتح و نصرت کی دعائیں کر رہے تھے۔ میدان جنگ میں پہنچ کر جالوت نے بنی اسرائیل میں سے کسی کو مقابلے کے لیے طلب کیا۔ بنی اسرائیل میں سے حضرت داوٗد جو لڑائی کی غرض سے نہیں آئے تھے اور ان کی عمر بھی ابھی چھوٹی تھی، جالوت کے مقابلے کے لیے نکلے اور آتے ہی جالوت کا کام تمام کر دیا۔ بادشاہ کی موت نے مخالف فوج کے حوصلے پست کر دیے، وہ بھاگ گئے اور بنی اسرائیل کو فتح نصیب ہوئی اس واقعہ کے بعد حضرت داوٗد علیہ السلام بنی اسرائیل میں بہت ہر دل عزیز ہو گئے اور بعد میں خدا کے برگزیدہ پیغمبر اور بنی اسرائیل کے بادشاہ بنے۔ چونکہ آپ رسول بھی تھے اور بادشاہ بھی، اس لیے اللہ نے آپ کو قرآن حکیم میں خلیفہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے تورات ہی الہامی کتاب تھی مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد کو بھی زبور عنایت کی۔ زبور میں خدا کی حمد و تعریف کے گیت تھے۔ حضرت داوٗد کی آواز اس قدر پیاری اور شیریں تھی کہ جب آپ زبور کو پڑھتے تو انسان تو انسان، چرند و پرند تک وجد میں آ جاتے۔ اسی لیے آج تک ''لحن داوٗدی'' مشہور ہے۔ ان کی خوش آوازی کی اللہ نے قرآن میں بھی تعریف کی ہے۔ حضرت داوٗد نے سو سال کی عمر میں وفات پائی اور شہر صعیون میں دفن ہوئے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2016ء ہے۔

نام: ______________

شہر: ______________

مکمل پتا: ______________

موبائل نمبر: ______________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2016ء ہے۔

نام: ______________

مقام: ______________

مکمل پتا: ______________

موبائل نمبر: ______________

ہونہار مصور

نومبر کا موضوع ''لاری اڈہ'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 نومبر 2016ء ہے۔

نام ______________ عمر ______________

مکمل پتا: ______________

موبائل نمبر: ______________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______________ شہر ______________

مقاصد ______________

موبائل نمبر: ______________

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں تعلیم و تربیت عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔ آپ کے رسالے میں سب لکھاری بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ اور اس کے تمام لکھاریوں کو گلاب کی طرح مہکتا رکھے۔ فضاؤں میں پرندوں کی طرح چہکتا اور آسمان پر ستاروں کی طرح دمکتا رکھے۔ آمین! پلیز آپی، میرا پہلا خط ردی کی ٹوکری کی نظروں سے چھپا کر رکھیے گا۔ (حفصہ رزاق، خانیوال)

آپ کیسی ہیں؟ سرورق اس رات کی طرح تھا جس پر ان گنت ستارے بڑی سج دھج سے رات کو منور کر رہے ہوتے ہیں۔ حمد و نعت بہت خوب تھیں۔ تمام کہانیاں چنبیلی کا پھول تھیں۔ اس کی مہک تازہ تھی۔ معلومات کی بادِ صبا بھی خوب پیغامِ عقل لائی۔ لیاقت علی خان (شہید ملت) پر لکھی گئی تحریر بہترین تھی۔ ضرب المثل کہانی نہایت عمدہ سلسلہ ہے۔ مارخور پر لکھی گئی تحریر بہت خوب رہی۔ تمام کا تمام شمارہ دل میں گھر کر گیا۔ تعلیم و تربیت اچھا اور معیاری رسالہ ہے۔ تعلیم و تربیت کا مطالعہ بھی معلومات اور کردار سازی کے حوالے سے بہترین ہے لیکن علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عمل بھی کرنا چاہیے۔ اپنا بھی حال تھوڑا لکھ دوں۔ میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔ اس لیے پچھلے شماروں میں شرکت نہ ہو سکی۔ اب وقت نکال کر لکھ رہا ہوں۔ خط کو جگہ ضرور دیجیے گا۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ تمام قارئین کے لیے بہت سی دعائیں۔ آپ سب پر سلامتی ہو۔

اے تعلیم و تربیت تو شاداب رہے
تیری تحریروں کے نگینے لاجواب رہیں

(کیڈٹ اسامہ ظفر راجہ، ملٹری کالج مری)

اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم بخیر و عافیت ہو گی۔ اکتوبر کا شمارہ خوب تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میں نو ماہ سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی مرتبہ کر رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت واحد رسالہ ہے جس کا میں بہت بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ اس کے تمام تر سلسلے، کہانیاں، تحاریر معلوماتی اور اچھی ہوتی ہیں۔ میرے پاس تعلیم و تربیت کے کچھ پُرانے شمارے ہیں جن میں سلسلہ "جنگل سے جنگل تک" مجھے بہت پسند آیا۔ میری تعلیم و تربیت سے گزارش ہے کہ سلسلہ "جنگل سے جنگل تک" دوبارہ شروع کیا جائے۔ جب آپ کو میرا خط موصول ہو گا تو اسلامی مہینہ "محرم" کا آغاز ہو چکا ہو گا، لہٰذا میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو نیا سال مبارک ہو۔ اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت ہر سال کی طرح اس سال بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا۔ اس دفعہ میں کچھ کہانیاں اور ایک تصویر بھی بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اُترے گی۔ یہ میرا پہلا خط ہے، اُمید ہے کہ آپ خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین!

(معصومہ زینب، اسلام آباد)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ! تحریروں کے ذریعے ضرور شرکت کیجیے گا۔

اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ حمد و نعت اور پیارے اللہ کے پیارے نام اچھے رہے۔ آپ میری ای میل سے کیا ناراض ہیں؟ اُمید ہے شامل کریں گی۔ (محمد عثمان اسلم، عنبرین اسلم)

☆ ہم آپ سے کیسے ناراض ہو سکتے ہیں۔ آپ کی ای میل حاضرِ خدمت ہے۔

پیاری آپیا! کیا حال ہے؟ آپ اور آپ کی پوری ٹیم رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ ٹائٹل پیج دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ رسالہ اندر سے مزے دار ہے۔ ستمبر کے مہینے میں بھی شرکت کی تھی، شاید ڈاک آپ تک پہنچ نہ پائی ہو تو ہم ذرا سا بھی مایوس نہ ہوئے اور اُمید کا دامن پکڑے رکھا۔ "ٹرائی ٹرائی اگین" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ قلم اور کاغذ پکڑ لیا اور سوچا کہ بچوں کے ہاتھوں میں قلم اور کاغذ ہی اچھا لگتا ہے۔ تعلیم و تربیت کی تمام کہانیاں نمبر ون تھیں لیکن اکمل تصور کی کہانی "احساس" نے ہمیں بھی احساس دلا دیا۔ "بچوں کا انسائیکلوپیڈیا" میں بدنام بھارتی "را" کو دیکھ کر خون غصے سے کھول اُٹھا جس نے پاکستان کو دولخت کرنے، کالا باغ ڈیم کی تعمیر رکوانے اور دھماکے کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ (فائزہ وحید، بھیرہ وال)

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پہ اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

ایڈیٹر صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے کہ خیرو عافیت سے ہوں گی۔ قلم ہمارے ہاتھ میں ہے اور خط لکھنا شروع کر دیا ہے۔ میرا نام ہاجرہ ہے۔ ایک بار پھر حاضر ہوں۔ اکتوبر کے شمارے کا سرورق رسالے کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اُمید ہے کہ میری کہانی جو کہ پچھلے ماہ آپ کو بھیجی تھی جس کا عنوان ''خدا تو ایسے بھی دیتا ہے'' مل گئی ہوگی۔ اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش جاری ہے۔ پچھلے ماہ حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسالہ عروج پر تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر روحی، ٹھگ، جادوگر کا بھائی، سیٹھ بریانی والا، سبق اور احساس تو ٹاپ پر تھیں۔ ''جینا وہی جو دوسروں کے لیے ہو'' تحریر پسند آئی۔ اس کی وجہ سے معلومات میں بہت اضافہ ہوا اور ہیلن کیلر کے بارے میں پتا چلا۔ ''پیارے اللہ کے پیارے نام'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ناول ''چاندنی رات میں سانپ'' بہت مزے کا ہے۔ کچھ دنوں بعد میرے پیپر شروع ہونے والے ہیں، اس وجہ سے زیادہ نہیں لکھ رہی۔ میرے امتحان کے لیے دعا کیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ فی امان اللہ!

(بی بی ہاجرہ، ہری پور)

☆ آپ کا خوب صورت خط پڑھا، بہت اچھا لگا۔ اپنی تحریروں کے لیے ٹیلی فون پر رابطہ کریں۔

اُمید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گی۔ تعلیم و تربیت بہت عمدہ رسالہ ہے، اُمید کرتی ہوں مزید نکھرے گا۔ بہت ماہ بعد خط لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں اپنی کہانی دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ سب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یہ کہانی تو میرے لیے بہت بڑا سرپرائز تھا۔ انعام پہلے مل گیا جب کہ رسالہ بعد میں ملا تھا۔ اکتوبر کے شمارہ کی کیا بات...... واہ! بہت ہی دل چسپ اور عمدہ تھا۔ محمد حسنات کی تحریر ''جینا وہی ہے جو دوسروں کے لیے ہو'' بہت ہی دل چسپ تھی۔ آپ نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا سلسلہ شروع کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ اس سلسلے سے بچوں میں اسلامی واقعات کو پڑھنے کا شوق اُبھرتا ہے۔ ویسے رسالے میں کوئی حرف بھی ایسا نہیں جو کہ ہمارے لیے مفید نہ ہو۔ تعلیم و تربیت نے بچوں کو جینے کا قرینہ سکھایا۔ مجھے تعلیم و تربیت سے محبت ہے، بے پناہ عقیدت ہے۔ پلیز، میرا پورا خط شائع کیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حافظ و نگہبان ہو۔ آمین!

(حفصہ اعجاز، صوابی)

☆ خط لکھنے کا شکریہ! آئندہ بھی آپ کی تحریروں کا انتظار رہے گا۔

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! آپ کیسی ہیں؟ پیاری آپی جان ہم ''تعلیم و تربیت'' رسالہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس میں شرکت بھی کرتے رہتے ہیں۔ آپی! ہمیں آپ سے ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ آپ ہمارے خطوط شائع نہیں کرتیں۔ پورا مہینہ بے صبری سے انتظار کرنے کے بعد جب رسالہ گھر پہنچتا ہے تو اس میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ جگہ کی کمی کے باعث خطوط شائع نہیں کیے گئے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے خطوط کو بھی جگہ دی جائے۔ اُمید ہے کہ آپ ہماری یہ خواہش رد نہیں کریں گی۔ آپی جان! ہم نے ''اکتوبر'' کے شمارے کے لیے ستمبر میں ''ٹارڈیگریڈز'' کے متعلق معلومات اور ایک قسط وار کہانی ''بڑے ڈھول کی سزا'' بھی بھیجی تھی مگر وہ شائع نہیں ہوئی۔ پلیز آپی اس شمارے میں ہماری تحریریں ضرور شائع کیجئے گا۔ اللہ ہمارے ''تعلیم و تربیت'' رسالے کی کشش کو ہمیشہ برقرار رکھے۔ آمین!

(قریشہ فاطمہ فاروقی، محمد علی فاروقی، رحیم یار خان)

☆ اپنی تحریروں کے لیے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ کریں۔

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلام۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی تعلیم و تربیت کا سرورق ٹاپ پر تھا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ اس رسالے کی جتنی بھی تعریف کروں، کم ہے۔ یہ رسالہ میرے گھر میں سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں لیکن کبھی اس کے لیے لکھا نہیں اور اب میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ہر ماہ کھوج لگانے والوں کا نام ضرور شائع کیا کریں تاکہ بچوں میں جذبہ پیدا ہو۔ اوجھل خاکے کا سلسلہ جاری رکھیے۔ سلسلہ وار کہانی چاندنی رات میں سانپ بہت اچھی چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(فاکہہ خالد راؤ)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

میمونہ نوید، راول پنڈی۔ فاطمہ عمر، ملتان۔ شہریار کفیل، گوجرانوالہ۔ حافظ ابوبکر طاہر۔ عمر منظور، محمد افضل انصاری۔ رباب، عائشہ خالد، لاہور۔ معتصم الٰہی، شیخوپورہ۔ مقدس جبار، حیدر آباد۔ ماریہ نوید، حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ احسن جاوید۔ ایمن سیف رینالہ خورد۔ محمد طارق زمان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ماہ نور نبیل، فائزہ رزاق، حفصہ رزاق، خانیوال۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ ارتضیٰ احمد، رشدہ عدنان، عزیز احمد، کراچی۔ مہروب خاور، کندیاں۔ اسامہ بن خرم۔ محمد عثمان اٹک۔ محمد عمر فاروق، سیال کوٹ۔ عبدالرحیم، پیر محل۔ احسن فاروق، راول پنڈی۔ محمد یاسین قمر، خانیوال۔ عفت بتول، لاہور کینٹ۔ افتخار بھٹی، جہلم۔ رجبہ محمد اسلم، راول پنڈی۔ نوشین مسعود، ملتان۔ بینش آفاق، کراچی۔ وقار صادق، راول پنڈی۔ انیتا یوسف، گوجرانوالہ۔

حمیرا کے گھر آج ایک چھوٹا سا فریج آیا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب تک اس نے بہت تکلیف اُٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ تھوڑی تھوڑی رقم بچاتی رہی۔ کہتے ہیں کہ قطرہ قطرہ کر کے دریا بن جاتا ہے۔ یہی حال رقم کا بھی ہے۔ حمیرا نے بھی تنگی ترشی اُٹھا کر اتنی رقم جمع کر لی کہ آج اس کے گھر فریج آ گیا۔ اسی خوشی کے موقع پر خالہ بھی موجود تھیں۔

''مجھے بہت خوشی ہے حمیرا، تمہارے گھر فریج آ گیا۔ خیر سے اب ضروریات بڑھ گئی ہیں۔ بغیر فریج کے گزارہ مشکل ہوتا۔''

''جی خالہ! بچوں کی وجہ سے اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ گرمی میں ہر چیز خراب ہو جاتی ہے۔ دودھ تو فوراً ہی پھٹ جاتا ہے۔''

''ماشاء اللہ! تمہارے دونوں بیٹے بہت پیارے ہیں۔ اب کتنے ماہ کے ہو گئے؟''

''اب تو چار ماہ کے ہو گئے دونوں، مسکرانے بھی لگے ہیں۔'' حمیرا نے خوش ہو کر بتایا۔

''خدا کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں جڑواں بیٹے عطا کیے۔ وہ بھی صحت مند اور خوب صورت۔ خدا انہیں زندگی دے۔''

''بس خالہ اب تو ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں اور ضروریات بھی۔ مہنگائی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔''

اتنے میں چچا بھلکڑ بھی آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولے۔ ''مہنگائی تو بڑھ رہی ہے مگر ہماری بیگم بہت ہوشیار ہیں۔ انہوں نے اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ پیدا کر لیا ہے۔''

''اچھا! کیا کام کرتی ہو تم؟''

''ارے کچھ نہیں خالہ۔ بس چند چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس سے کچھ رقم مل جاتی ہے۔ میں تو کسی سے ذکر نہیں کرتی۔ یہ خواہ مخواہ......''

''ارے تو اس میں بُرائی کیا ہے؟ یہ تو بہت عمدہ بات ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حمیرا کا ایک بچہ رونے لگا۔

''ارے! شاہد رو رہا ہے۔'' حمیرا نے لپک کر بچے کو اٹھا لیا۔

''بھئی کمال ہے!'' خالہ بولیں۔ ''تم کس طرح پہچان لیتی ہو کہ کون سا شاہد ہے اور کون سا عابد؟ ہو بہو ایک ہی شکل ہے دونوں کی۔''

حمیرا ہنسنے لگی۔ ''بس خالہ کپڑوں سے پہچان لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ شاہد کے گال پر کاجل سے تل بنا دیتی ہوں۔''

''بھئی مجھے تو یہی یاد نہیں رہتا کہ ہماری بیگم شاہد کے گال پر تل لگاتی ہیں یا عابد کے۔'' چچا بھلکڑ نے کہا۔ ان کی اس بات پر خالہ بی

خوب ہنسیں۔

آج بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ دیا گیا۔ دودھ بھی فریج میں رکھا گیا۔ حمیرا خوش تھی۔ اس نے میاں سے کہا۔ ''اب روز روز آپ کو گوشت لانے کی ضرورت نہیں۔ پورے ہفتے کے لیے اکٹھا لے آیئے گا۔ فریزر میں رکھ دوں گی۔''

''ارے واہ! یہ تو مجھے خیال ہی نہ آیا۔ بھئی واہ وا...... خوب!'' چچا بھلکڑ نے خوش ہو کر دائیں بائیں گردن ہلائی۔ شام کو خالہ بی اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

اچانک حمیرا کو یاد آیا کہ گھر میں شادی کا کارڈ آیا ہوا ہے۔ اس نے چچا بھلکڑ سے کہا۔ ''ارے سنیے، میں آپ کو بتانا بھول گئی، کل میری چچا زاد بہن مریم کی شادی ہے۔ پرسوں کارڈ آیا تھا، یہ لیجیے۔''

چچا کارڈ دیکھ کر بولے۔ ''میں تو ان لوگوں سے واقف نہیں۔''

''ہاں، اتفاق ہے۔ ایک بار چچی آئیں تو آپ دفتر میں تھے۔ پرسوں ان کی بڑی بیٹی کارڈ لے کر آئی تھیں تو اس وقت بھی آپ دفتر گئے ہوئے تھے۔ دراصل چچا کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب چچی کس کے ساتھ آئیں جائیں۔ بیٹا بھی کوئی نہیں۔''

''تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟ تم جاؤ گی شادی میں؟''

''میرا تو بہت دل چاہ رہا ہے، مگر عابد اور شاہد ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اپنی طرف سے میں نے معذرت کر لی تھی مگر آپ کی شرکت کا وعدہ کر چکی ہوں۔ شادی کی تقریب ''شادی گھر'' میں ہے۔ کارڈ میں پتا لکھا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، مجھے جانا ہوگا۔''

''ضرور...... آپ کا جانا بے حد ضروری ہے۔ مریم مجھے بہت چاہتی ہے اور وہ ہے بھی بہت اچھی۔''

''ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی شادی کا کھانا کھائے ہوئے مدت ہو گئی ہے، خوب ڈٹ کر کھاؤں گا۔''

''ارے نہیں، کہیں ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ دیکھنے والے بھلا کیا کہیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' اچانک چچا بگڑ گئے۔ ''شادی میں جاؤں گا اور خالی پیٹ واپس آ جاؤں گا۔ لوگ جتنا کھاتے ہیں، کبھی غور کیا تم نے؟ پلیٹ میں بوٹیوں کا مینار بناتے ہیں۔ کھاتے کم اور پھینکتے زیادہ ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔'' حمیرا دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

حمیرا اور بچے سو چکے تھے۔ چچا بھلکڑ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ گوشت والے کی دُکان پر بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ لائن لگانی پڑتی ہے۔ دُکان دار کہہ رہا تھا کہ وہ صبح سویرے دُکان کھول دیتا ہے۔ اس وقت کوئی گاہک نہیں ہوتا۔ اب میں ایسا کروں گا کہ کل سویرے ہی سویرے پہنچ جاؤں گا۔ کل 25 دسمبر کی چھٹی ہے۔ دیر تک سوئے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیگم بھی خوش ہو جائیں گی۔ چپ چاپ دو کلو گوشت لا کر فریزر میں رکھ دوں گا۔ یہی سب سوچتے سوچتے وہ سو گئے۔

صبح پانچ بجے ان کی آنکھ کھلی۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں ویسے بھی دیر سے صبح ہوتی ہے۔ بہرحال، چھ بجے گھر سے نکل گئے، حالاں کہ دُکان ساڑھے چھ بجے کھلتی تھی۔ حمیرا نے انہیں گھر سے جاتے دیکھ لیا تھا مگر یہ سوچ کر پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ خواہ مخواہ ناراض ہوں گے۔

اب چچا بھلکڑ دُکان پر پہنچے تو وہ بند تھی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ انتظار کر لیں گے۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھ گئیں۔ گوشت والا نہ آیا۔ اب ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ ایک صاحب کو چچا نے روک کر وقت پوچھا۔ ''کیوں بھئی، کیا وقت ہوا ہے؟''

''سات بج کر بیس منٹ۔''

''اُفوہ! اتنی دیر!'' یہ کہہ کر چچا اِدھر اُدھر بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ اس طرح آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ دُکان نہ کھلی۔ اب تو چچا کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے سامنے والے پان والے سے پوچھا۔ ''ارے بھائی، تمہیں کچھ معلوم ہے یہ گوشت کی دُکان آج کیوں نہیں کھلی؟''

پان والا ہنسنے لگا۔ ''آپ کو نہیں معلوم، جی؟''

''نہیں...... تمہیں معلوم ہو تو بتا دو۔''

''آج بدھ ہے، بھائی جی۔ منگل اور بدھ کو گوشت کا ناغہ ہوتا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ!'' چچا نے جھنجھلا کر گردن دائیں بائیں گھمائی۔

''اچھا! تو آپ اتنی دیر سے اسی وجہ سے کھڑے تھے۔'' پان

والے نے مسکرا کر کہا۔ چچا بھلکڑ نے کوئی جواب نہ دیا۔ غصے سے پاؤں پٹختے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے۔ حمیرا پریشان کھڑی تھی۔ خدا جانے میاں جی سویرے سویرے کہاں چلے گئے! میاں گھر آئے تو اس نے سکون کی سانس لی اور بولی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟ میں تو پریشان ہوگئی۔''

''جہنم میں۔'' چچا نے غصے سے کہا اور دھم سے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ان کا موڈ سخت آف تھا۔ حمیرا ڈر کر خاموش ہوگئی۔ پھر بولی۔ ''ناشتا لے آؤں؟''

''لے آؤ۔''

ناشتا کر کے میاں جی کے حواس درست ہوئے تو ساری روداد سنائی۔ حمیرا کو ہنسی تو آئی مگر اس نے ظاہر نہ کیا۔ اتنی مشکل سے تو میاں جی کا موڈ ٹھیک ہوا تھا۔ اب کہیں پھر نہ بگڑ جائے۔

آج مریم کی شادی تھی۔ حمیرا نے میاں کا شلوار سوٹ اچھی طرح سے استری کیا اور بولی۔ ''یہ لیجیے، میں نے آپ کے کپڑے استری کر دیئے ہیں۔ شیروانی پہن کر جائیے گا۔ اچھی لگے گی۔''

''جوتے بھی پالش کر دینا۔''

''وہ بھی کر دیئے ہیں۔ دیکھئے، کیسے چمک رہے ہیں۔''

چچا بھلکڑ خوش ہو گئے۔ اب حمیرا ایک بڑا سا پیکٹ لے آئی۔

''یہ کیا ہے؟'' چچا نے پوچھا۔

''یہ مریم کے لیے تحفہ ہے۔''

''مگر اس میں ہے کیا؟''

''اس میں ساڑھی ہے۔ وہی جو میری سہیلی ثریا میرے لیے لائی تھی۔ میں نے ابھی استعمال نہیں کی۔ اس وقت مریم کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں، اس لیے......''

''مگر یہ تو بہت قیمتی ساڑھی ہے۔''

''ہاں، مگر مریم کی محبت سے زیادہ نہیں۔ آپ اسے کسی ذمے دار آدمی کے ہاتھ میں دیجیے گا۔ ویسے میں نے اپنے نام کی پرچی لگا دی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، دے دوں گا۔''

''اور ہاں، چچی وغیرہ سے اچھی طرح اپنا تعارف کروا دیجیے گا۔''

اچانک چچا کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ بولے۔ ''اچھی طرح سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا کہوں ان سے؟ میں غریب ہوں، کلرک ہوں، سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اسی لیے اپنے پرائے سب چچا بھلکڑ کہتے ہیں۔ کیوں؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا؟ بولو!''

آج کل چچا کو نہ جانے کیوں غصہ آ جاتا تھا۔ حمیرا ڈر گئی۔ بولی۔ ''نہیں، نہیں۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔''

رات آٹھ بجے کا بلاوا تھا۔ چناں چہ چچا بھلکڑ تیار ہو کر آٹھ ہی بجے شادی گھر پہنچ گئے۔ اس شادی گھر کے دو لان تھے، لان اے اور لان بی۔ مریم کی شادی لان بی میں تھی۔ چچا بھلکڑ لان اے میں پہنچ گئے۔ یہاں بھی کسی شادی کی دعوت تھی لیکن مہمان ابھی

نہیں آئے تھے۔ ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ چچا اپنا تحفہ لے کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

نو بجے مہمان آنے شروع ہوئے۔ چچا تو کسی کو پہچانتے نہ تھے، اس وجہ سے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جب خاصے لوگ آ چکے تو اچانک انہیں اپنے دفتر کے دانش صاحب نظر آ گئے۔ دانش صاحب کی نظر چچا پر پڑی تو وہ بھاگے بھاگے آئے۔

''ارے چچا! آپ؟ واہ! آج تو خوب جچ رہے ہیں!''

''ہاں، بھئی۔ میری بیوی کے رشتے داروں میں شادی ہے۔ لیکن میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔''

''کوئی بات نہیں، میں تو آ گیا ہوں۔''

''دانش میاں، یہ تحفہ دینا ہے۔''

''لائیے، میں پہنچائے دیتا ہوں۔ وہ دیکھیے، سامنے لڑکیاں تحفے لے کر اسٹیج پر رکھ رہی ہیں۔''

چچا نے تحفہ دانش کو تھما دیا۔ دانش تحفہ دے آئے۔ خلافِ معمول کھانا جلد لگ گیا۔ چچا نے ڈٹ کر کھایا۔ مووی بھی بن گئی۔ اچانک چچا کے کالر کے اندر ایک کیڑا گھس گیا۔ چچا بہت گھبرائے۔

''شیروانی اُتار کر جھاڑ لیں۔'' دانش نے کہا۔ ''کہیں کیڑا کاٹ ہی نہ لے۔''

چچا نے گھبرا کر شیروانی اُتاری۔ ارے! یہ کیا؟ چاروں طرف لوگ قہقہے لگانے لگے۔ چچا سخت شرمندہ ہوئے۔ دراصل وہ قمیص پہننی بھول گئے تھے۔ اندر سے میلی بنیان جھانک رہی تھی۔ کیڑا جھاڑ کر چچا نے دوبارہ شیروانی پہن لی۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔'' دانش نے تسلی دی۔

مگر اب چچا ایک منٹ بھی رُکنے کے روادار نہ تھے۔ دس بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے لان اے سے نکل گئے۔ سامنے ہی لان بی تھا۔ ہائیں! یہ کیا؟ یہاں تو بہت سے رشتے دار نظر آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ غلط جگہ پہنچ گئے تھے۔ ارے، ہاں! یاد آیا، مریم کی شادی تو لان بی میں تھی۔

تھوڑی دیر پہلے کی شرمندگی لمحہ بھر میں زائل ہو گئی۔ چچا سینہ تان کر لان بی میں گئے۔ رشتے داروں نے انہیں حمیرا کی چچی سے ملوایا۔ وہ بہت محبت سے ملیں۔ حمیرا اور دونوں بچوں کو بہت بہت پوچھا اور دعائیں دیں۔

یہاں کھانا ذرا دیر سے شروع ہوا۔ چچا نے کسی پر کچھ ظاہر نہ کیا اور تھوڑا بہت دوبارہ کھا لیا۔

لان بی میں آنے کے بعد جوں ہی چچا کو اپنی بھول کا احساس ہوا تھا، وہ بھاگ کر لان اے میں گئے تھے اور دانش کے ذریعے اپنا تحفہ واپس لے آئے تھے۔ چناں چہ انہوں نے تحفہ چچی کے ہاتھ میں دے دیا۔

کھانے کے بعد چچی نے ایک تھیلے میں پلاؤ اور دوسرے میں قورمہ بھر کر چچا کو دیا اور بولیں۔ ''لو، یہ حمیرا بیٹی کو دے دینا۔''

''ارے چچی اتنا کھانا؟''

''ارے میاں، فریج میں رکھ لینا۔ فریج تو ہوگا تمہارے پاس۔''

''جی ہاں۔ فریج تو ہے ہمارے گھر، بالکل ہے۔ اس میں رکھ لیں گے۔'' چچا خوش ہو کر بولے۔ ایک رشتے دار انہیں اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑ آئے۔

حمیرا، میاں کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے پلاؤ اور قورے کو دیگچیوں میں ڈال کر فریج میں رکھا۔ اتنی دیر میں چچا بھلکڑ نے کپڑے تبدیل کر لیے۔ اس بار حمیرا کو ان کی حماقتوں کی خبر نہ ہو سکی کیوں کہ وہ آرام سے لیٹ کر شادی کی روداد سنا رہے تھے اور حمیرا خوش ہو رہی تھی۔

تین چار دن گزر گئے۔ چچا کی خوش مزاجی میں فرق نہ آیا، کیوں کہ شادی کے بعد یہ پہلی بھول تھی جس کا پتا حمیرا کو نہ چل سکا۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتے تھے اور خوشی سے گن گناتے بھی تھے۔

دوسرے دن اچانک شام کے وقت ایک کار آ کر دروازے پر رکی۔ حمیرا کی چچی آئی تھیں۔ حمیرا خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ سلام دعا کے بعد چچی نے کہا۔

''حمیرا، میں وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ بھئی، یہ کیا حماقت کی تم نے؟ اتنا قیمتی تحفہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں ڈبا واپس لے کر آئی ہوں۔''

حمیرا بولی۔ ''چچی، ہم لوگ غریب ضرور ہیں، مگر اتنے بھی نہیں کہ مریم کو تحفے میں ایک ساڑھی بھی نہ دے سکیں۔''

''میں ساڑھی کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو زیور کی بات کر رہی ہوں۔''

''زیور؟ کیسا زیور؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں، چچی؟''

اب چچی نے پلاسٹک کے تھیلے سے پیکٹ نکال کر کھولا۔ اس کے اندر سرخ رنگ کی ساڑھی جھلملا رہی تھی اور ایک عدد زیور کا ڈبا بھی تھا جس میں بہت خوب صورت سونے کا سیٹ تھا۔

''یہ کیا ہے، چچی؟''

''یہ تم نے بھیجا تھا، اپنے میاں کے ہاتھ۔''

''نہیں، چچی! میں نے تو نیلی ساڑھی بھیجی تھی۔''

''بھئی، یہ پیکٹ شاد میاں نے خود میرے ہاتھ میں دیا تھا۔''

''عجیب بات ہے! یہ کیسے ممکن ہے؟''

''اپنے میاں سے پوچھو، بلا کر۔''

حمیرا حیران پریشان میاں کو بلا لائی۔ ان کے سامنے سارا معاملہ رکھا گیا۔ چچا بھلکڑ خاموش بیٹھے دیکھتے اور سنتے رہے۔

''آپ بولتے کیوں نہیں؟ یہ کیا قصہ ہے؟'' حمیرا نے میاں کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

اب چچا بھلکڑ کو بتانا ہی پڑا۔ ''میں غلطی سے لان اے کی شادی میں چلا گیا تھا اور تمہارا تحفہ انہیں ہی دے آیا تھا۔ بعد میں لان بی میں گیا تو پتا چلا کہ مریم کی شادی ادھر ہو رہی ہے۔ پھر میں واپس لان اے میں گیا اور ان سے تحفہ واپس لایا۔ میرا خیال ہے غلطی سے تحفہ بدل گیا۔''

''اس تحفے پر حمیرا کا نام لکھا ہوا ہے۔'' چچی بولیں۔

''ہائے اللہ! یہ کیا غضب کیا آپ نے؟ اب ہم کس طرح معلوم کریں گے کہ یہ کس حمیرا کا تحفہ ہے؟''

''ہاں! بھئی، جس کی امانت ہے، اسے واپس کرنی چاہیے۔ تم معلوم کرو، اس روز لان اے میں کس کی شادی تھی۔'' چچی نے کہا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ میرے دفتر میں دانش صاحب کام کرتے ہیں۔ ان ہی کے رشتے دار کی شادی تھی۔ کل ہی پتا چل جائے گا۔''

خیر صاحب، دانش میاں کے ذریعے یہ معاملہ حل ہو گیا۔ وہاں بھی ساڑھی اور زیور کی ڈھنڈھیا پڑی تھی۔ معلوم ہوا دلہن کی حمیرا باجی سعودی عرب سے لائی تھیں۔ یہ انہی کا تحفہ تھا۔ ان کی امانت ان کو پہنچائی گئی اور حمیرا کا تحفہ اسے واپس مل گیا جو حمیرا نے مریم کو بھجوا دیا۔

چچا بھلکڑ اس قدر شرمندہ تھے کہ کچھ کہتے بن نہ پڑتی تھی۔ حمیرا بھی خاموش خاموش سی تھی۔ چچا نے بیوی کی خاموشی کو محسوس کیا تو بولے۔ ''اب ایسی بھی کیا خاموشی، سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ تم بھی ٹھیک ہو جاؤ۔''

حمیرا پھر بھی خاموش رہی تو چچا بھلکڑ بولے۔ ''ابھی تمہیں اصل واقعہ تو معلوم ہی نہیں ہوا۔ اب جب کہ ہر بات کھل چکی ہے تو وہ واقعہ بھی سن لو۔ کسی بہانے تمہیں ہنسی تو آئے۔''

یہ کہہ کر چچا بھلکڑ نے شیروانی والا واقعہ کہہ سنایا۔ حمیرا کو ہنسی تو آئی مگر یہ ایک ایسی ہنسی تھی جس کے اندر چھپے ہوئے غم کو چچا بھلکڑ محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ ☆☆☆

پنجاب کی سرزمین پر بہنے والے پانچ دریاؤں میں سب سے چھوٹا دریا "دریائے راوی" ہے۔ یہ دریا بھارتی ریاست ہماچل پردیش کے ضلع کانگڑہ میں درہ روہتنگ کے علاقہ میں ہمالیہ کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ اس کی لمبائی 726 کلومیٹر ہے۔ صوبہ پنجاب کا دارالحکومت لاہور "دریائے راوی" کے مشرقی کنارے پر آباد ہے۔

دریائے راوی کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ تاریخ دانوں کے مطابق 485 تا 521 قبل از مسیح داریوس کے زمانے میں دریائے راوی کا ذکر ملتا ہے۔ اس زمانے میں اس کو "دریائے اراوتی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب وید میں اس کا نام "پرشنی" ہے۔ انگریز محققین کیتھ اور میک ڈونل نے بھی لکھا ہے کہ دریائے پرشنی ہی بعد میں دریائے راوی کہلایا۔ دس بادشاہوں کی جنگ کا کچھ حصہ دریائے اراوتی کے کنارے لڑا گیا۔

دریائے راوی پاکستان میں پٹھان کوٹ اور مادھو پور کے مقام پر داخل ہوتا ہے۔ یہ سرحدی علاقہ کے ساتھ ساتھ تقریباً 85 کلومیٹر لمبا ہے۔ لاہور سے گزر کر یہ کمالیہ کی طرف سے ہوتا ہوا احمد پور سیال کے قریب دریائے چناب میں مل جاتا ہے۔ ماضی میں دریائے راوی پورے زور و شور سے بہتا تھا اور زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد بھارت نے دریائے راوی کا پانی روکنا شروع کر دیا جس سے مسائل پیدا ہونے لگے۔ ورلڈ بنک کے تعاون سے 1960ء میں سندھ طاس معاہدہ طے پایا جس کے مطابق ستلج، بیاس اور راوی کا پانی بھارت کے حصہ میں آیا اور چناب، جہلم اور سندھ کے دریا پاکستان کو ملے۔ دریائے راوی کے پانی پر بھارت کا پورا کنٹرول ہونے کے بعد اس کا پانی پاکستان میں نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

وہ دریا جس کی لہریں کبھی شاہی قلعہ کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں، اب ایک ندی کی صورت رہ گیا ہے۔ اکثر خشک اور بنجر میدان کی طرح نظر آتا ہے۔ لاہور کی تمام گندگی بھی اس میں پھینکی جاتی ہے۔ کارخانے کے فضلات اور زہریلے مادے اور کیمیائی اجزا کی وجہ سے دریائے راوی کی حالت شدید متاثر ہوئی ہے۔ سیلاب سے بچاؤ کے لیے بند باندھنے سے ماضی میں دریائے راوی کے دو حصے ہوئے جس میں ایک کو بڈھا دریا کہا جانے لگا۔ اس بند کے باعث دریا لاہور سے پانچ، چھ کلومیٹر دور ہو گیا۔

لاہور میں مغل حکمرانوں کی یادگار عمارتیں دریائے راوی کے کنارے تعمیر ہیں۔ مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہاں اور باغ شاہدرہ اپنی منفرد طرز تعمیر کے باعث شان دار اور خوب صورت تعمیرات مانی جاتی ہیں۔ کامران کی بارہ دری 1530ء میں مغل بادشاہ ہمایوں

کے سوتیلے بھائی کامران نے تعمیر کرائی جو اس وقت لاہور کا حکمران تھا۔ مرزا کامران نے دریائے راوی کے پار ایک باغ لگوایا جو سولہ سو فٹ مربع پر پھیلا ہوا تھا۔ باغ کے درمیان میں ایک وسیع تالاب بنوایا گیا اور اس تالاب کے درمیان میں یہ بارہ دری تعمیر کرائی گئی تھی اور یہ وہ جگہ تھی جہاں مرزا کامران نے اپنے والد بادشاہ اکبر کا لاہور آنے پر استقبال کیا۔

بارہ دری کی تعمیر دریائے راوی کے دائیں کنارے کی گئی تھی۔ اس زمانے میں خشکی کے راستے دریائے راوی تک پہنچا جاتا تھا لیکن بعد میں پانی کے بہاؤ کی سمت تبدیل ہونے سے بارہ دری دریا کے درمیان آ چکی ہے۔ یہاں سیر کے لیے آنے والے دریائے راوی کے پل کے پاس بنائی گئی سیڑھیوں سے دریا کے کنارے تک پہنچتے ہیں، پھر کشتیوں پر سوار ہو کر بارہ دری تک پہنچتے ہیں۔ دریائے راوی اب اس حد تک خشک ہو چکا ہے کہ یہاں آنے والے نوجوان پیدل گزر کر بارہ دری تک پہنچتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں بہت زیادہ ثقافتی تقریبات منعقد کی جاتی تھیں لیکن اس عمارت کی حالت بہت خراب ہونے کی وجہ سے کچھ سالوں سے یہاں تقریبات منعقد کرنا ختم کر دی گئی ہیں۔

مغل حکمرانوں کی المناک تاریخ کا ایک تلخ واقعہ بھی اس بارہ دری سے وابستہ ہے۔ بادشاہ جہانگیر کے باغی بیٹے خسرو کو اس ہی بارہ دری میں گرفتار کر کے جہانگیر کے سامنے لایا گیا تھا۔ جہانگیر نے خسرو کے باغی ساتھیوں کو سزائے موت اور اپنے بیٹے خسرو کی آنکھیں نکالنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر جہانگیر نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا۔ ”بادشاہ کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔“ جہانگیر نے خود بھی اپنے باپ جلال الدین اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس دوران جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی شہنشاہ اکبر کے ساتھ اتنی قربت ہو گئی تھی کہ خسرو کے بادشاہ بننے کا سب کو یقین ہونے لگا تھا۔ اکبر کی زندگی کے آخری حصہ میں جہانگیر اور اکبر کی صلح ہونے پر ایسا نہ ہو سکا اور جہانگیر بادشاہ بننے کے لیے اپنے ہی بیٹے کی بغاوت کا سامنا کر رہا تھا۔

دریائے راوی کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ ہندو اور مسلم مذاہب کے روحانی پیشواؤں نے اس کے کناروں پر قیام کیا۔ کئی اہم مذہبی مقامات راوی کے کنارے آباد ہیں۔

حضرت شاہ حسین المعروف مادھو لال حسین جیسی عظیم روحانی شخصیت راوی کنارے رہتے تھے۔ ان کے جد کلس رائے لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فیروز شاہ تغلق کے دور میں مسلمان ہوئے۔ شاہ حسین کے والد کپڑا بنانے کے پیشے سے وابستہ تھے۔ شاہ حسین 1538ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد شیخ عثمان ٹکسالی گیٹ کے باہر آباد تھے۔ اس محلے کو ”تل بگھ“ کہتے تھے۔ حضرت شاہ حسین کے انتقال کے حوالے سے ”حقیقت الفقراء“ میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ حسین ہر ہفتہ کو دریائے راوی پر سیر کرنے جاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کشتی پر سوار تھے۔ انہیں ریگستان نظر آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”کشتی بان! مجھے یہاں اُتار دو۔“ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ شاہ حسین یہاں ایک نشانہ مقرر کر کے تیر چلانے لگے۔ بعد میں اپنے ساتھ آنے والوں سے کہا۔ ”اگر کوئی حقیقی دوست اپنے دوست کو اپنی طرف بلائے تو کیا کرنا چاہیے۔“ دوستوں نے کہا۔ ”اگر وہ بارادہ وصل بلاوے تو بجان منت اُٹھ کر جانا چاہیے۔“ پس آپ کا انتقال ہو گیا۔ وہیں تجہیز و تکفین ہوئی، نماز جنازہ میں تمام اولیاء کرام تشریف لائے۔ بڑی دیر تک آپ کا مزار دریائے راوی کے کنارے رہا لیکن جب دریائے راوی نے رُخ بدلا تو اکثر آپ کا مزار سیلاب کی زد میں آ جاتا تھا۔ اس پر آپ کے مرید مادھو نے آپ کی نعش نکال کر شالا مار باغ کے قریب دفن کی۔

داتا گنج بخش علی ہجویریؒ اپنے پیر کے حکم سے 1039ء میں لاہور پہنچے اور دریائے راوی کے کنارے قیام فرمایا۔ داتا صاحب کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف اسلامی وہ ہے جس کا ایک قدم بھی دائرہ اسلام سے باہر نہ ہو۔ لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ 20 صفر کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ عوام آپ کو داتا گنج بخش (خزانے بخشنے والا) اور داتا صاحب کہتے ہیں اور آپ انہی القاب سے مشہور ہیں۔

دریائے راوی اور دریائے چناب کا علاقہ دوآبہ رچنا کہلاتا ہے۔ دریائے راوی کی بڑی بڑی نہریں اپر باری دوآب مادھو پور (بھارت) سے نکلتی ہے۔ اس کی قصور برانچ پاکستان کو سیراب کرتی ہے۔ نہر لوئر باری دوآب کے ہیڈ ورکس بلوکی میں ہیں۔ یہ نہر اضلاع ملتان اور ساہی وال کو سیراب کرتی ہے۔ گنجی بار ساہی وال اور ملتان کو سیراب کرنے کے لیے راوی کا پانی کافی نہ تھا۔ چناں چہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے چناب کا پانی بلوکی کے مقام پر بذریعہ نہر اپر چناب دریائے راوی میں ڈالا گیا۔

لاہور کے قریب دریائے راوی ایک نالے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ دریا کے کنارے لاکھوں افراد ہیں۔ یہ صدیوں پرانی تہذیبوں اور داستانوں کو اپنے اندر لیے آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 رنومبر 2016ء ہے۔

اکتوبر 2016ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- سردی میں کریں گے دنگل، جنگل میں ہو گیا منگل (حفصہ رزاق، خانیوال)
- سارے جانور ہیں حیران، نرالی ہے بندر میاں کی شان (عائشہ شہباز، وہاڑی)
- گرمی سے بے زار، جانوروں کی پول میں بہار (شہیرہ احمد، راول پنڈی)
- ایلیگیٹر نے کیا دھوم مچائی، بڑے بڑوں کی ہوئی جگ ہنسائی (رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان)
- تالاب بنا پکنک پوائنٹ، جس میں جانور ہیں انوائیٹ (سارا زاہد، اسلام آباد)

ہونہار مصور

خوب صورت پرندے

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

یشل سلیم، لاہور (دوسرا انعام :175 روپے کی کتب)

اسامہ ظفر راجہ، مری (تیسرا انعام :125 روپے کی کتب)

دُرِ مکنون، گجرات (پہلا انعام :195 روپے کی کتب)

جویریہ شیر علی، اسلام آباد (پانچواں انعام :95 روپے کی کتب)

روا بٹ، لاہور (چوتھا انعام :115 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ثناء و رباب حیدر، راول پنڈی کینٹ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ سیدہ معصومہ زینب نقوی، اسلام آباد۔ حمیرا ریاست، واہ کینٹ۔ دعا بلال۔ آمنہ اقبال۔ فاطمہ نجم، راول پنڈی۔ ایمن فاطمہ، ملتان۔ عظمیٰ شہزادی، گجرات۔ ولیجہ فاطمہ۔ فروا جمیل، لاہور۔ محمد جنید حفیظ، ڈیرہ غازی خان۔ رمیشہ الیاس، صادق آباد۔ زرنب سلیم، لاہور۔ محمد ہشام، مہر و شکیل۔ شہیرہ احمد۔ محمد عبداللہ الیاس، صادق آباد۔ مریم طارق، راول پنڈی۔ میمونہ نوید۔ احد سلیم۔ اسد سلیم۔ عازب سبحانی، محمد خاور، شیخوپورہ۔ محمد حماس صارم، لاہور۔ ثناء لیاقت، حویلی لکھا۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ طاہرہ بتول، کوئٹہ۔ فصیح احمد، راول پنڈی۔ قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ جویریہ طارق، راول پنڈی۔ محمد سعد بشارت، لاہور۔ ماریہ نوید، فیصل آباد۔ جاوید خان، لاہور۔ نعیمہ شمیم، کراچی۔ صالحہ کاردار، کوئٹہ۔ تنویر اکبر، سیال کوٹ۔ آفاق شاہد، گوجرانوالہ۔ زینب اظہر، راول پنڈی۔ تہمینہ بشیر، سیال کوٹ۔ آسیہ الیاس، فیصل آباد۔ نذیر احمد، لیہ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دسمبر کا موضوع
پاک فوج
آخری تاریخ 8 نومبر

نومبر کا موضوع
لاری اڈہ
آخری تاریخ 8 اکتوبر